ابن صفی

پیاکوسکی تلاش

محبت کے روپ ہزار ہوسکتے ہیں لیکن اس کا ہر رنگ اور ہر روپ
جہاں اپنی جگہ دلکش ہوتا ہے وہیں اس کی خوبصورتی [illegible]
آدمی کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے کہ لوگ اسے مجنوں
اور [illegible] مجبور ہو جاتے ہیں

ناک میں دم کر رکھا تھا گھر بھر کا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ ایم اے کے پہلے سال میں پڑھتی تھی۔ فلسفہ لے رکھا تھا۔ باپ آزاد خیال اور جدت پسند تھے اور ماں اول درجے کی قدامت پسند۔ نقاب ڈالے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں اور شوہر پر خار کھاتی تھیں کہ بیٹی کو اتنی آزادی کیوں دے رکھی ہے۔ صبیحہ نے انھیں اتنا پریشان کیا تھا کہ قریب تھا کہ ماں کے جذبات ہی فنا ہو کر رہ گئے تھے اور اب وہ ان کے لیے ایک ایسی ہستی بن گئی تھی جس کی صورت دیکھتے ہی ان کا پارہ آسمان پر چڑھ جاتا۔ باپ بھی کسی مسئلے میں دخل نہیں دیتے تھے۔ کبھی جو بہت ہوا تو ان کے کان پر جوں رینگ جاتی۔ صبیحہ کی شوخیوں پر صرف مسکرا کر رہ جاتے تھے۔ کبھی اس سے کسی بات کی بازپرس نہیں کی تھی۔ اگر وہ اپنے کسی بوائے فرینڈ کو بھی گھر پر بلا لیتی تو شاید انھیں اعتراض نہ ہوتا۔ ویسے صبیحہ نے کبھی ایسا کیا نہیں تھا۔ چاہا نہیں کوئی بوائے فرینڈ۔ وہ تو محض اپنی ماں اور نانی کو جلانے کے لیے کسی سہیلی کے بھائی کا تذکرہ لے بیٹھتی۔ وہ جتنی جلتیں، اور صبیحہ کا جی چاہتا کہ ان سے کہتی "ارے بس دوستی ہے ان سے۔ کوئی میرے عاشق تھوڑا ہی ہیں۔"

ماں لفظ عاشق پر ہزاروں صلواتیں سناتیں اور کہتیں "نادیدی کمبخت یہ تو بازاری عورتوں کے سے انداز ہیں یوں باتیں کرتی ہے؟"

اس پر وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں انھیں سمجھاتی کہ عاشق کو عاشق کہا ہی نہیں گے تو ناشاد وان نہیں۔ ویسے اگر ناشاد وان سمجھے سے مفہوم لیا جائے تو وہ مجنوں لیلیٰ کا عاشق تھا جسے مجنوں لیلیٰ کا ناشاد وان تھا بھی کہہ سکتی ہے۔

ایسی باتوں پر انھیں اس زور سے غصہ آتا کہ ان کی زبان ہی بند ہو جاتی اور پھر نانی جو شروع کرتیں گالیاں اور کوسنے تو سنتے سنتے آنکھ کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ نئی نئی اصطلاحیں سننے میں آتیں۔ وہ آدھی اردو اور آدھی پوربی میں گفتگو کرتیں اور غصے کی حالت میں پوربی اور اردو اس طرح گڈمڈ ہوتی کہ ایک تیسری زبان عالم وجود میں آ جاتی جسے شاید وہ خود بھی نہ سمجھ پاتیں۔

صبیحہ دوسروں کو چڑانے میں ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرتی تھی۔ جب کسی کو اپنی باتوں پر جھنجلاہٹ میں مبتلا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے سارے جسم میں ہلکی ہلکی سرور انگیز سی گدگدی ہو رہی ہو۔

جس دن اسے کوئی ایسا موقع نصیب نہ ہوتا اس کا جی بھی کہیں نہ لگتا۔ کسی کام میں دل ہی نہ لگتا۔ لوگوں کو جھلاہٹ میں مبتلا کرنے کے لیے نئی نئی حرکتیں کرتی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ ان کا انجام کہیں کسی حادثے کی شکل میں نہ ظاہر ہو۔

آج تو ایسی حرکت کر گزری تھی کہ جس کی بنا پر کسی بھی کنواری لڑکی کی شامت بلا علم و اطلاع آ سکتی تھی۔

اپنے فرضی عاشق کی طرف سے خود ہی ایک خط لکھ ڈالا تھا۔ کئی طرح کے انداز تحریر پر قادر تھی لہٰذا ماں کے دھوکا کھا جانے میں کوئی شبہ ہی نہیں تھا۔ یہ خط ایسی جگہ رکھ دیا گیا جہاں ماں یا نانی کی نظر ضرور پڑے۔

اس نے اپنے فرضی عاشق کی طرف سے لکھا تھا۔

"جان سے زیادہ پیاری صبیحہ!

تم سے ملنے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ تم تین دن سے یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہیں۔ متواتر تین راتوں سے جاگ رہا ہوں۔ کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا۔ جس دن تم سے ملاقات نہیں ہوتی کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ تمھارے گھر آتا مگر تم پہلے ہی بتا چکی ہو کہ والدہ صاحبہ بڑی جلاد قسم کی خاتون ہیں۔ ان سے ڈر لگتا ہے ورنہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تمھارے بنگلے کی کمپاؤنڈ کی دیوار پھلانگ کر اندر چلا آؤں۔ بھئی یہ تو آج رات کو ہی کروں گا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ بارہ بجے رات کو [illegible] ری میں ملنا۔ تم پہلے ہی بتا چکی ہو کہ تمھارے یہاں کتے نہیں ہیں پھر کیا ڈر ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ ویسے مجھے اس کا علم ہے کہ تمھارے پاپا دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ فقط تمھارا اختر"

◆

بہرحال خط ماں کے ہاتھ لگا۔ پڑھ کر سناٹے میں رہ گئیں۔ وہ چھپ چھپ کر انھیں دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ سر تھامے بیٹھی رہیں پھر اپنی ماں کے پاس گئیں۔ صدمہ بھی تھا اور غصہ بھی۔ دونوں میں کچھ کھسر پھسر ہوئی اور پھر صبیحہ نے دونوں کے رونے کی آواز سنی۔ بڑی بی تو باقاعدہ بین کر رہی تھیں لیکن کیا کہہ رہی تھیں یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ البتہ اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس ٹھونس کر ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چھوٹے بھائی بہن اسکول گئے ہوئے تھے ورنہ پورا بنگلہ ماتم کدہ بن کر رہ جاتا۔ وہ خود بھی تین دنوں سے یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ موڈ نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد دونوں خواتین کمرے سے باہر آئی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں پر ورم سا آ گیا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ صبیحہ نے دور سے دیکھا اور کنی کاٹ کر دوسری طرف نکل گئی۔ ڈر تھا کہ سامنا ہوتے ہی اسے ہنسی نہ آ جائے۔ وہ تو اس کی منتظر تھی کہ اب وہ دونوں اس پر گرجیں برسیں گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ شام تک انھوں نے اس سے کوئی بات نہ کی بس قہر آلود نظروں سے گھورتی رہیں۔ البتہ صبیحہ نے محسوس کیا کہ تینوں ملازموں کو کچھ خاص قسم کی ہدایات دی جا رہی ہیں۔ وہ سمجھ گئی کہ دونوں خواتین کی یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگی پھر ہنسی کے مارے اس کا برا حال ہو گیا کہ شاید وہ دونوں اس کے خیالی دوست کو گھیرنے کی اسکیم بنا رہی ہیں۔ اس نے سوچا مزا آئے گا۔ تینوں ملازم گیارہ بجے رات تک پائیں باغ میں چھپے بیٹھے رہیں گے اور یہ دونوں بار بار برآمدے میں نکل کر دیکھیں گی کہ شکار پھنس گیا یا نہیں۔

چھوٹے بہن بھائی اسکول سے آئے تو گھر میں سناٹا تھا۔ ان بے چاروں کو بھی تشویش ہوئی ہوگی کہ آج یہ گھر قبرستان کیوں بن گیا ہے۔ ان میں سے شاید کسی نے ماں سے پوچھ بھی لیا تھا کہ باجی کہاں ہیں؟

بس پھر کیا تھا شامت آ گئی اس کی۔ چٹاچٹ کئی طمانچے پڑ گئے۔ اس نے چنگھاڑنا شروع کر دیا۔ پھر جو بھی دریافت حال کو قریب گیا وہ چار ہاتھ اس نے بھی کھائے۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی اور صبیحہ بڑے اطمینان سے اپنے کمرے میں لیٹی پڑھے ہوئے رسائل کے اشتہارات پڑھتی رہی۔

چھوٹا بھائی جس کی عمر بارہ سال تھی پتنگ بازی کے شوق میں مبتلا ہونے کی بنا پر پٹنے سے بچ گیا تھا۔ وہ اسکول سے آتے ہی پتنگ اور چرخی سنبھال کر چھت پر جا چڑھا تھا۔

بہرحال ہنگامہ فرو ہونے کے بعد اسے بھی فکر ہوئی تھی کہ آخر ان سبھوں کی پٹائی کس بنا پر ہوئی تھی۔ ماں یا نانی سے تو پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ پٹنے والوں سے پوچھا لیکن وہ وجہ نہ بتا سکے۔ آخر صبیحہ سے ہی پوچھنا پڑا۔

"کمبخت ہے تمھاری..." صبیحہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"کیوں باجی انھوں نے کیا کیا ہے؟"

"اگر میرے بڑے بھائی ہوتے تو وہ بے چارے کیوں پٹتے۔"

"میں نہیں سمجھا باجی۔"

"ارے اگر میرے بڑے بھائی ہوتے تو انھیں ہی میری تھوڑی سی فکر ہوتی۔ پاپا کو تو نہیں ہے۔ امی کو اس کا بڑا قلق ہے۔ کہتی ہیں کہ اگر انور بڑا بھائی ہوتا تو اب تک کبھی کی صبیحہ بیاہی جا چکی ہوتی۔ ان حضرت کو تو فکر ہی نہیں ہے کسی بات کی۔"

وہ فوراً سمجھ بیٹھے کہ ہم جا رہے ہیں باجی کے لیے دولہا ڈھونڈنے۔

"واقعی؟" صبیحہ نے تحیر آمیز سنجیدگی سے پوچھا۔

"یس سر"

"اچھا تو جاؤ۔ شاباش۔"

اس نے سوچا اب براہ راست ہنگامے کے امکانات ہیں۔ وہ بھی چپکے سے اٹھ کر بھائی کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ یہاں بھائی ماں سے کہہ رہا تھا۔

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں امی! پاپا کو فکر نہ ہو مجھے تو ہے۔"

"کاہے کی فکر؟" وہ جھلا کر بولیں۔

"باجی کی فکر۔ میں نے ڈھونڈ لیا ہے چودھری اشرف کا۔ مویشی خانے کے منشی ہیں۔"

قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتیں صبیحہ نے جھک کر پوچھا۔ "اچھا بڑی بڑی مونچھیں ہیں، دیہاتی ہیں، شلوار پہنتے ہیں کرتہ بھی۔"

"وہ تو ہوا... ہمارا؟" دفعتاً نانی جوتی اتارنے کے لیے جھکیں اور وہ اچھل کر بھاگی۔

اب نانی اور ماں دونوں اس کے پیچھے دوڑ پڑی تھیں۔ وہ کترا کر نکل گئی اور برآمدے سے گزر کر پائیں باغ میں چلی آئی اور وہ دونوں برآمدے ہی میں کھڑی ہانپتی رہ گئیں۔

پھر آ گئی شامت اس بھائی کی جسے بہن کی فکر تھی۔ ماں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹنا شروع کر دیا تھا اور صبیحہ لان میں پڑی ہوئی بے تحاشا ہنس رہی تھی۔

پھر رات تک ہنگامہ ہی رہا تھا اور تینوں ملازمین پائیں باغ کے کسی گوشے میں چھپے بیٹھے تھے۔ ماں اور نانی بار بار برآمدے تک جاتیں اور پھر واپس آ جاتیں۔

صبیحہ بھی کبھی کبھی ان کی لاعلمی میں ادھر ادھر جھانک آتی۔ پھر ساڑھے دس بجے وہ کچھ ایسی بے چینی ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ان دونوں کی دانست میں ابھی کئی بار برآمدے تک گئی اور پھر اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ ماں اور نانی اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی رہی تھیں۔

پھر گیارہ بج گئے اور ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور اس کی ماں سے بولا۔ "بیگم صاحبہ وہ باہر فرش پر پکڑا گیا ہے۔ وہ باہر

پڑنے تو پوچھیں!"

صبیحہ برابر والے کمرے میں گھس رہی تھی۔ ہنسی روکنے کے لیے اسے منہ میں دوپٹہ ٹھونسنا پڑا۔

نوکر کو سرگوشیوں میں کچھ ہدایات دیں اور پھر وہ واپس چلا گیا۔ صبیحہ نے سوچا اب اسے بھی بیرونی برآمدے کی طرف جانے کے لیے بیتابی ظاہر کرنی چاہیے۔

وہ دبے پاؤں چوروں کی طرح راہداری کی طرف بڑھی۔ لیکن ماں اور نانی اماں دروازے کے درمیان حائل نظر آئیں۔

وہ اس طرح ٹھٹک گئی جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔

"کہاں چلیں؟" ماں نے [illegible] پوچھا۔

"وہ... ارے... تم... مطلب یہ کہ... دل گھبرا رہا ہے۔ ذرا ٹہلوں گی۔" اس نے رنگ اڑا کر کانپتے ہوئے کہا۔ گھبراہٹ کی بڑی شاندار ایکٹنگ کر رہی تھی۔

"چل بیٹھ!" وہ ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ "ورنہ آج [illegible] پھر دیکھوں گی [illegible]"

"بیگم! یہ ظلم [illegible]" اس نے کسی قدر بڑبڑا کر کہا۔

"تم تو... [illegible] کی بچی..." وہ ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف لپکیں لیکن پھر وہ خود وہاں سے بھاگی تو اپنے کمرے میں آ کر دم لیا۔ دروازہ مقفل کر کے بستر پر لوٹنے لگی۔ ہنسی کے مارے سانس نہیں سما رہی تھی۔ پیٹ دبا دبا کر ہنستی رہی۔

ادھر بیگم صاحبہ [illegible] پھر بیرونی برآمدے کی طرف چلی گئی تھیں۔ صبیحہ سوچتی اور ہنستی رہی۔ کیسا [illegible] اسے [illegible] کے لیے فرصت ہوئی اور وہ کم بخت [illegible] جانے کس بے چارے کو تاک بیٹھا ہے۔ انتظار ہو رہا ہے کہ کب [illegible] اور وہ اسے دھر لیں۔ بابا اگر موجود ہوتے تو شرارت کامیاب نہ ہو سکتی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کس طرح کی طرز تحریر پر قادر ہے۔ وہ خود ہی انہیں اپنے [illegible] دکھا چکی تھی۔ اگر بابا کے سامنے خط پیش کیا جاتا تو وہ اس قسم کی دوسری تحریروں کے ساتھ ہی [illegible] کر رکھ دیتی۔

تھوڑی دیر تک وہ چپ لیٹی رہی پھر دروازہ کھول کر جھانکا ہی تھا کہ ایک شور سنائی دیا۔

دونوں نوکر بھاگتے ہوئے اندر گئے۔

"پکڑ لیا... بیگم صاحبہ!" دونوں نے بیک وقت ہانک لگائی تھی۔

"کہاں ہے؟ کہاں ہے؟" بیگم صاحبہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"امیرا نے سر پر چادر ڈال کر گھسیٹ لیا تھا۔ اگر [illegible] تو ہم لوگ چپ چاپ بیٹھے... کھونٹی پر چادر باندھ کر گردن میں گرہ لگا دی۔ [illegible] دیکھا ہو گا کہ کس نے چادر ڈالی اور کس نے گھسیٹ مارا۔"

"پھر کیا کیا؟"

"بند کر دیا ہے سالے کو۔"

صبیحہ نے سنا اور [illegible] ہو گئی۔ [illegible] لیا۔

[illegible] وہ بھی [illegible] دوڑ پڑی۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی بتاتی ہوں۔" ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ پھر نوکر سے پوچھا: "کہاں ہے؟"

"بند کر دیا ہے سٹور میں۔"

"کسے بند کر دیا ہے؟" صبیحہ بھی سمجھ گئی۔

نوکر نے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا لیکن وہ کچھ کہے بغیر سٹور روم کی طرف چلی گئیں۔ سٹور روم کیا اچھا خاصا رہائش کا کمرا تھا جس میں [illegible] فرنیچر اور روزمرہ کی ضرورت کا سامان پڑا رہتا تھا۔

صبیحہ بھی ان کے پیچھے ہی پیچھے چلی آئی۔

کھڑکی کی دوسری طرف ایک صحت مند اور وجیہ نوجوان [illegible] کھڑا احمقانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہا تھا۔

اس کی [illegible] بیگم صاحبہ بھی [illegible] پھر خود کو سنبھال کر سخت لہجے میں بولیں: "[illegible]"

"جی جی... میں ابھی [illegible] سکا"

صبیحہ ان کے پیچھے کھڑی وحشت زدہ نظروں سے اسی آدمی کو گھورے جا رہی تھی جو وجیہ ہونے کے باوجود [illegible] معلوم ہوتا تھا۔

"تمہارا نام اختر ہے؟" بیگم صاحبہ [illegible]

"جی... [illegible] کیا فرق پڑتا ہے۔"

"تم ہمارے کمپاؤنڈ میں کیوں گھسے تھے؟"

"جی... میں تو... میں تو گھسیٹا گیا ہوں، زبردستی پکڑ کر [illegible]"

"کیا بکواس ہے۔"

"جی ان سے پوچھیے جنہوں نے سر پر چادر ڈال کر مجھے اس حال کو پہنچایا ہے۔"

"کیوں؟" بیگم صاحبہ نوکروں کی طرف مڑیں۔

"جی [illegible] گھس ہی آتے۔ بڑی دیر سے پھاٹک کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔"

صبیحہ کا دل اور شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہیں پولیس کیس نہ بن جائے۔ ساری شرارت دھری رہ جائے گی۔ اب کیا ہو گا۔

"بہرحال تم اختر ہو؟"

"جی ہاں میں اختر ہوں۔"

"تم لوگ جاؤ یہاں سے۔" وہ ملازموں کی طرف مڑ کر بولیں۔

ملازم چلے گئے لیکن صبیحہ وہیں کھڑی رہی۔ بیگم صاحبہ کے انداز سے ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا جیسے انہیں وہاں صبیحہ کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو۔

بیگم صاحبہ چند لمحے نوجوان کو [illegible] آلود آنکھوں سے گھورتی رہیں پھر [illegible] کر پوچھا: "تم صبیحہ کو خطوط لکھتے رہتے ہو؟"

"جی... جی ہاں۔" اس نے احمقانہ سعادت مندی کے انداز میں سر کو جنبش دی۔

صبیحہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"کیوں لکھتے ہو؟" بیگم صاحبہ ڈانٹ کر بولیں۔

"بس جی چاہتا ہے۔"

"جی چاہتا ہے کہ تجھے... میں تمہیں جیل میں ڈلوا دوں گی۔"

"اب جو مرضی ہو۔"

"میں تم پر چوری کا بھی الزام لگاؤں گی۔"

"آپ نے [illegible]"

"[illegible]... [illegible]..."

"جی اچھا۔" اس نے پھر سعادت مندی کا اظہار کیا۔

صبیحہ کا سر چکرانے لگا۔ [illegible] اختر کی طرف [illegible] اس نے تو خود ہی خط لکھا تھا [illegible] کوئی وجود ہی نہیں تھا لیکن یہ کون؟

کون ہے یہ؟ کیوں اتنا بڑا الزام اپنے سر لے رہا ہے؟ [illegible] پولیس کے حوالے کیا جائے گا۔ یک بیک صبیحہ [illegible] کے آگے [illegible] اور بولی: "تم کون ہو؟ میں تمہیں نہیں جانتی۔ تم نے مجھے کبھی خطوط نہیں لکھے۔"

قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا بیگم صاحبہ کا [illegible] ہاتھ صبیحہ کے منہ پر پڑا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ [illegible] نہ چل سکا کہ وہ دونوں ہاتھ بیگم صاحبہ کے تھے یا کسی [illegible] کے ذریعہ چلنے والے [illegible] سنائی پاس

[illegible] گالوں اور [illegible] برستی رہیں۔ بیگم صاحبہ [illegible] تو نہ جانے کیوں [illegible] رونا شروع کر دیا اور [illegible] طرف چلی گئیں۔ [illegible] ان کے پیچھے جھپٹتی تھیں لیکن صبیحہ [illegible] اس [illegible] نوجوان کو گھورے جا رہی تھی۔

"مجھے اس پر حیرت نہیں ہے۔" نوجوان نے جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا: "میری امی تو ان سے بھی زیادہ تیز ہیں۔"

"تم کون ہو؟"

"اختر... اختر پرویز صدیقی۔"

"یہاں کیسے آگئے تھے؟"

"میں یہاں خود نہیں آیا، لایا گیا ہوں۔ کسی نے پیچھے سے سر پر چادر ڈال کر گھسیٹ لیا۔"

"ہمارے پھاٹک کے سامنے کیوں کھڑے تھے؟"

"اپنے دوست چوہدری عبداللطیف کا بنگلہ تلاش کر رہا تھا۔ دو [illegible] گیا۔ ماڈل کالونی میں اس کے علاوہ کسی کو نہیں جانتا۔"

"تو تم [illegible] ہو؟"

"جی ہاں۔"

"یہاں آس پاس کوئی عبداللطیف نہیں رہتا۔" صبیحہ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پھر چونک کر بولی: "تم نے خواہ مخواہ یہ کیوں کہہ دیا کہ مجھے خطوط لکھتے رہتے ہو؟"

"نہیں تو..." نوجوان نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا: "میں نے تو نہیں کہا۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ تم صبیحہ کو خط لکھتے رہتے ہو۔ میں نے کہہ دیا جی ہاں!"

"پھر کیوں کہہ دیا؟"

"میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ [illegible] کے منہ پر [illegible] قیامت [illegible] آ جاتی۔"

"میں صبیحہ ہوں... سمجھے؟" وہ جھنجھلا کر بولی۔

"وہ... ارے واہ!" نوجوان نے [illegible] ہنسنا شروع کر دیا۔ [illegible] تمام ہنسی [illegible] تو بولا: "[illegible] اتفاق... میری کزن کا نام بھی تو صبیحہ ہی ہے۔ میں اسے خطوط لکھتا رہتا ہوں۔"

"تم واقعی احمق معلوم ہوتے ہو۔ بالکل گھامڑ! اب [illegible] جاؤ گے۔ دیکھ لینا!" صبیحہ کو اس پر بے تحاشہ غصہ آ رہا تھا۔

"تب تو واقعی بہت برا ہوا۔" نوجوان [illegible]

"وہ میرے [illegible] پر جیب کٹ گئی [illegible] بھی

بکس میں تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے رشوت مانگی تھی۔ کہاں سے دیتا۔ آخر اس نے سامان رکھوا لیا اور کہنے لگا جاؤ اپنے دوست چودھری عبداللطیف سے پیسے لے کر آؤ تب سامان دوں گا۔"

"اوہ! تو کیا تمہیں صحیح پتا نہیں معلوم اپنے دوست کا؟"

"ایک بار پہلے بھی آ چکا ہوں اس لیے بستی کا نام یاد رکھنے کی کبھی ضرورت نہیں محسوس کی تھی اور اب تو ہر ایک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں، بھوک کے مارے دم نکل رہا ہے۔"

"میں کیا کروں! یہاں قفل لگا دیا گیا ہے اور چابی جی کے پاس ہے۔"

"اور ڈ ڈ... ڈیڈی کہاں ہیں؟" نوجوان نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"ڈیڈی ہوتے تو اس کی نوبت ہی نہ آنے پاتی۔"

"میں کیا کہوں!"

"میں کیا کروں،" صبیحہ مضطربانہ انداز میں بڑبڑائی۔

"آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟"

"آپ ایک غلط فہمی کی بنا پر اس طرح پکڑے گئے ہیں لیکن وہ یقین نہیں کریں گی۔"

"کس بات پر یقین نہیں کریں گی؟"

"یہی کہ آپ وہ اختر نہیں ہیں اور سمجھ آپ کی کوئی بات نہیں سنیں گی۔"

"بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ ابھی بات ہے آپ مجھے یہیں بند رہنے دیجیے لیکن کچھ کھلوا تو دیجیے ورنہ اب میں بھوک کے مارے بے ہوش ہی ہو جاؤں گا۔"

دفعتاً پشت سے تائی کی آواز آئی: "ارے لو! یہ حرافہ لڑکی اس سے باتیں کر رہی ہے۔ کیا فائدہ ہوا!"

پھر انہوں نے تینوں نوکروں کو آوازیں دیں جو دوسرے ہی لمحے میں وہاں پہنچ گئے۔ تائی انہیں لے کر آگے بڑھیں اور صبیحہ کو پیچھے دھکیلتی ہوئی بولیں: "مارو بے صورت حرام کو۔"

"مار پیٹ صورت حرام کو!" اجنبی نوجوان نے چڑنے کے سے انداز میں کہا: "میں اتنا اُلّو نہیں ہوں۔ اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا رہا ہوں۔ مارنے سے پہلے انہیں دروازہ توڑنا پڑے گا۔ ادھر کے دروازے کی بھی کنڈی چڑھا رہا ہے... ہاں۔"

تائی کو شاید اس انداز گفتگو کی توقع نہیں تھی اس لیے ان کا منہ حیرت کے مارے کھلا رہ گیا۔ نوکروں نے بھی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکے کیونکہ نوجوان ظاہری رکھ رکھاؤ سے تو نچلے طبقے کا آدمی معلوم ہوتا تھا اور کوئی لفنگا لہٰذا انہیں تاؤ آ جانا ہی تھا۔

"نانی اماں! آخر کیوں؟ یہ کون ہیں، کیوں پکڑ لیا گیا ہے انہیں؟" صبیحہ جھنجھلائی ہوئی آواز میں بولی۔

"چل یہاں سے، چل نہیں تو سب کے سامنے جوتیاں لگاؤں گی۔" تائی نے آگے بڑھ کر اُسے دھکیلنا شروع کر دیا۔ وہ بہر طور ضعیف لیکن صبیحہ جیسی دس پر بھاری رہتیں۔ بڑی اچھی صحت تھی۔ بیٹی کی بڑی بہن ہی معلوم ہوتی تھیں۔

اُسے اس کے کمرے تک دھکیل لائیں۔ بیگم صاحبہ بھی اپنے کمرے سے نکل کر ساتھ ہو لی تھیں لیکن اس طرح چل رہی تھیں جیسے خواب میں چل رہی ہوں۔

صبیحہ نے سوچا اگر ان لوگوں نے آج بھی اس کے کمرے میں بند کر دیا تو پتا نہیں اس اجنبی کی کیا دُرگت بنا دیں۔ آزاد رہ کر وہ کم از کم ان کی کسی اسکیم میں رخنہ تو ڈال ہی سکتی تھی ورنہ ہو سکتا ہے ان کا کوئی غلط فیصلہ کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ بن جاتا۔ دفعتاً ایک تدبیر سوجھ گئی۔ اس کے نتائج بھی تباہ کن ہو سکتے تھے لیکن اتنے نہیں کہ تھانے پولیس کی نوبت آ جاتی۔

بہرحال اس نے تائی کے شانے پکڑے اور انہیں جھنجھوڑ کر بولی:

"ان کی طرف داری ہو رہی ہے جو ابھی کل ہی بڑبڑا رہی تھیں کہ چاقو پر سوار ہیں، بیٹوں کے یہاں نہیں جاتیں۔"

بڑی بی تو حیرت سے چونک پڑیں۔ پلٹ کر بیٹی کی طرف دیکھا جو حیرت سے منہ کھولے کھڑی تھیں۔

"جھوٹی ہی رہی ہیں۔" صبیحہ تڑ سے دوبارہ بولی: "جہاں سنا کسی بہو کے بچے ہونے والا ہے سر کے بل دوڑی چلی جاتی ہیں، چاہے میں مر ہی کیوں نہ رہی ہوں۔"

"ارے ناشدنی تجھ..." بیگم صاحبہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکیں کیونکہ بڑی بی چیختی ہوئی تھیں: "دیکھ لیں... وہ جھوٹی نہیں ہے اور چاہے جیسی ہو... کیا میں تجھے نہیں جانتی ہوں۔ سلمیٰ کی طبیعت پھر یہاں کی دہائی دیں تو نے۔"

"اور نوکروں کے سامنے بڑبڑاتی ہیں۔" صبیحہ نے ٹکڑا لگایا۔

بیگم صاحبہ تپ سے باہر ہو گئیں۔ گھونسہ تان کر جھپٹیں لیکن بڑی بی ان کے درمیان آ گئیں اور ہاتھ پکڑے لیے ہوئیں بولیں: "جھوٹ بکتی ہے تو تو چراغ پا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ارے اماں بیگم... کتنا..."

"بس بس... خبردار... جوانی کے چھ کہا لعنت ہے تجھ پر اور تیرے گھر پر اب جو بھی تم رکھو۔"

"ارے اماں، سنو تو سہی۔"

لیکن بڑی بی اس کی بات سننے کی بجائے جھنجھلاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں اور صبیحہ نے اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اب پوری رات کسی نہ کسی قسم کے ہنگامے ہی کی نذر ہوگی۔

"نکل کم بخت... نکل باہر... آج زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ دیکھتی ہوں کون تیرا کیا بگاڑ لے گا۔ بولا جان! اگر تیری لاش ہی دیکھیں گے۔" وہ دروازہ پیٹنے لگیں۔

"اس سے پہلے ہی یہاں پولیس پہنچ جائے گی۔" صبیحہ نے اندر سے کہا: "آپ نے خواہ مخواہ کسی شریف آدمی کو پکڑوا کر بند کر لیا ہے۔"

"اب تو وہ حرام زادہ بند ہی رہے گا تا کہ وہ بھی آ کر تیرے کرتوت دیکھیں جن کی بنا پر انہوں نے اتنی ڈھیل دے رکھی ہے۔"

"میرے کیسے کرتوت؟"

"اس میں تو نہیں جیت سکے گی۔ اُس مردود کا خط میرے پاس موجود ہے۔ جیل بھجواؤں گی۔"

"کیا اس نے آپ کو کوئی خط لکھا ہے؟"

"چپ حرام زادی... حرافہ۔" وہ حلق پھاڑ کر دہاڑیں اور انہیں کھانسی آنے لگی۔ اتنے میں پشت سے بڑی بی کی آواز آئی: "کیوں پیچھے پڑی ہے اس کے۔ کل ہی یہاں سے منہ کالا کر جاؤں گی۔"

"ارے اماں... یہ جھوٹی ہے۔" بیگم صاحبہ کھانستی ہوئی بولیں۔ وہ دوبارہ ہانپی ہوئی سی ہو گئی تھیں۔

"چلو جھوٹی ہی سہی لیکن دکھاؤ اس کا تم بڑی صاف دل اور نیک طینت ہو۔"

"آپ! اماں تم لیجیے... وہ ناشدنی..."

"بند کرو زبان۔" بڑی بی دہاڑیں اور بیگم صاحبہ جلدی جلدی وہاں سے چلی ہی گئیں۔

صبیحہ نے ان کے قدموں کی دور ہوتی ہوئی چاپ سن کر ہی دروازہ کھولا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے اب شاید کام بن جائے۔ سوچ رہی تھی کہ پچھلوں کے قریب پہنچ کر نے سے کہا تھا اور تائی کی آواز سنائی دی کہ نکال جا کر اس غذائی خوار کو۔"

اور پھر وہ بھی رہائشی کمروں کی طرف چلی گئیں۔ صبیحہ نے کنجی اُٹھا کر مٹھی میں دبالی اور کچھ دیر تک گہری خیالات میں کھوئی رہی پھر اسٹور روم کی طرف روانہ ہو گئی۔ اجنبی نوجوان کھڑکی کی سلاخیں پکڑے کھڑا تھا اور تینوں ملازم اسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی گوریلا ہو!

"تم لوگ جاؤ یہاں سے۔" صبیحہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں! اسے دیکھیے!" اجنبی سلاخوں کی دوسری طرف سے بولا: "دیکھیے دیکھیے یہ ایسا لگتا ہے جیسے ٹکٹ کلکٹر دیکھنے آئے ہوں۔"

"سنا نہیں تم لوگوں نے؟" صبیحہ نے دوبارہ انہیں للکارا اور وہ چپ چاپ کھسک گئے۔ صبیحہ اجنبی کی طرف متوجہ ہو کر بولی: "میں کھانا لائی ہوں۔"

"اوہ! تو اب آپ مجھے نکال باہر کریں گی؟" اجنبی نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں بالکل!"

"مقدر ہی خراب ہے اپنا۔" اجنبی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "اس طرح پکڑے جانے پر بڑی خوشی تھی کہ چلو رات بسر کرنے کی جگہ تو نصیب ہو گئی۔ شاید کچھ روکھی سوکھی کھانے کو بھی مل جائے۔"

"میں کھانا کھلاؤں گی آپ کو لیکن اگر آپ رات بھر یہاں بند رہ گئے تو پھر آپ کو اس وقت تک یہاں بند رہنا پڑے گا جب تک کہ ڈیڈی نہ آ جائیں۔"

"کیوں، آخر اس کی وجہ؟"

"میں نے کسی فرضی اختر کی طرف سے اپنے نام ایک عاشقانہ خط لکھا تھا امی کو جلانے کے لیے۔ وہ پرانے خیالات کی ہیں، پاپا الٹرا ماڈرن ہیں۔ انہوں نے مجھے آزادی دے رکھی ہے جس پر وہ کڑھتی ہیں۔ لہٰذا میں انہیں اور زیادہ جلایا کرتی ہوں۔ بہرحال میں نے اس خط میں لکھ دیا تھا کہ وہ یعنی اختر آج رات گیارہ بجے کمپاؤنڈ وال پھلانگ کر پائیں باغ میں داخل ہوگا۔ مقصد تھا کہ گیارہ بجے رات تک گھر میں ہلچل رہے۔ خط امی کے ہاتھ لگا کر اُسے لکھا ہی تھا۔"

اجنبی اُسے تحیر آمیز نظروں سے گھورتا رہا تھا، وہ مسکرائی اور سلسلۂ گفتگو جاری رکھا: "اس مرتبہ آپ پھنسے، اب وہ پاپا کو میرے کرتوت دکھانے کے لیے آپ کو ان کی واپسی تک قید رکھنا چاہتی ہیں۔"

"میں نہایت خوشی سے قید رہوں گا۔" نوجوان نے بڑے خلوص سے کہا۔

"کیا آپ کی دوسری منزل بالکل خالی ہے؟" صبیحہ نے بُرا سا منہ بنا کر پوچھا۔

"ہائے پھر وہی سوال؟" اجنبی روہانسا ہو کر بڑبڑایا۔

"کیا مطلب؟"

"پچھلی بار اسی سوال کی بنا پر انٹرویو میں رہ گیا ورنہ نوکری ضرور مل جاتی۔"

"کیوں نہیں ملی؟"

"بس اسی سوال کا جواب نہیں دے سکا تھا لہٰذا ملازمت نہیں ملی۔"

"یہ سوال کیا تھا کسی نے آپ سے؟" صبیحہ نے تحیر آمیز شوخی کے ساتھ پوچھا۔

اجنبی نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو آپ جواب نہیں دے سکے تھے؟"

"سوال ہی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔"

"سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا آپ کی کھوپڑی بالکل خالی ہے؟"

"یہ پوچھا تھا اس مردود نے۔" اجنبی کی آواز غصیلی تھی۔

"اور میں نے بھی یہی پوچھا ہے۔" صبیحہ آنکھیں بند کر کے مسکرائی۔

"میں تھپڑ ماروں گا تمہیں۔" اس نے سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ باہر نکالنے کی کوشش کی۔

"شٹ اپ۔"

"اب تو چاہے مجھ کو مار پڑے میں تمہیں ماروں گا ضرور۔"

"بلاؤں نوکروں کو؟"

"ارے جاؤ۔ بہت دیکھے ہیں۔ دھوکے سے پکڑ لیا ورنہ مار کر ہڈیوں کی چٹنی بنا دیتا۔"

"خفا ہونے کی ضرورت نہیں بڑے میاں۔"

"کیا کہا؟ بڑے میاں۔ میرا نام اختر پرویز ہے۔"

"اختر پرویز صاحب یہ نام مجھ جیسے کے لیے بکواس بند کیجیے۔ باہر تشریف لائیے۔ شاید میں آپ کے لیے کچھ مہیا کر سکوں۔ چند سانس اور دھکڑ سے جا رہے۔ اتفاق سے ہمارے یہاں سب ذہین ہیں اس لیے کچھ سمجھنے سمجھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اکثر ملازموں کو تو بدھوؤں کے ساتھ رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"میں تو باہر نہیں آؤں گا ہرگز نہیں۔ مجھے نیند بھی آ رہی ہے۔۔۔ اس شہر میں اجنبی ہوں۔ نوکری کی تلاش میں آیا تھا۔ واہ کیا نام ہے شہر کا عادل آباد اور کوئی بھی انصاف پسند نہیں۔"

"کیا مطلب؟ کیسا انصاف چاہتے ہیں آپ؟"

"یہ کہ زبردستی پکڑ لیا ہے تو اب دو چار دن تو قیام کرنے دیجیے۔"

"میرے پاپا ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ کھال کھنچوا دیں گے۔"

"ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ بہت آزاد خیال ہیں۔"

"ایسا تو نہیں کہ میرے کسی عاشق کو برداشت کر لیں۔"

"میں زبردستی تو عاشق ہوا نہیں، آپ ہی لوگوں نے پکڑوا لیا ہے۔ پیٹ بھر روٹی ملے تو شاید عاشق بھی ہو جاؤں۔"

"اپنی بکواس بند کرو مسٹر۔۔۔ میں بدتمیزی پسند نہیں کرتی۔"

"اگر عاشقی بدتمیزی ہوتی تو نصابی کتابوں میں اس کا ذکر نہ ملتا اور میر و غالب بدتمیز کہلاتے۔"

"ہوش میں ہو یا نہیں؟"

"پاسبانِ عقل نے اس وقت دل کو تنہا چھوڑ دیا ہے۔"

"میں کہتی ہوں نوکروں کو بلا کر مرمت کرا دوں گی۔"

"ضرور بلاؤ لیکن ان کی موت کی ذمے داری بھی تم ہی پر ہو گی۔"

صبیحہ نے آگے بڑھ کر قفل میں کنجی لگائی۔ دروازہ کھل گیا۔

اور وہ تیکھے لہجے میں بولی "نکلو۔"

"سارے شہر میں تم سے اپنے عشق کا اعلان کرتا پھروں گا۔"

اجنبی نے دھمکی دی۔

"مجھے دھمکی دے رہے ہو۔" صبیحہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"مرتا کیا نہ کرتا۔ مجھے رات بسر کرنے کے لیے جگہ اور پیٹ بھرنے کے لیے روٹی چاہیے۔"

"اچھا بابا ابھی مت کرو۔ پھاٹک کی بائیں جانب مالی کی کوٹھی خالی ہے جا کر ٹھیک رہو۔ میں روٹی بھی پہنچا دوں گی۔ پیچھا چھوڑو کسی طرح۔۔۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اجنبی سر ہلا کر بولا۔

صبیحہ نے چپ چاپ اسے اسٹور روم سے نکال کر پائیں باغ میں پہنچا دیا۔ وہ مستقل طور پر اسی کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ صورت سے احمق ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن کسی اچھے ہی خاندان کا تعلیم یافتہ فرد ہے۔ بے چارے کا سامان ریلوے اسٹیشن پر پڑا ہوا ہے۔ اُسے اس سے پوچھنا چاہیے کہ ٹکٹ کلکٹر کا مطالبہ کیا ہے۔ اُسے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ خواہ مخواہ بے چارہ اس کی ایک شرارت کا شکار ہو گیا۔ شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو پتا نہیں کیا طوفان برپا کرتا۔

وہ سوچتی اور اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتی رہی۔ بیگم صاحبہ اور شبی بی اپنے اپنے کمروں میں بند ہو کر سو

گئی تھیں اس لیے عمارت میں سناٹا تھا۔

وہ بہت احتیاط سے ملی کی کوٹھری کی طرف چل پڑی۔ سوچ رہی تھی کہ کوٹھری میں اندھیرا ہو گا لیکن روشنی بھی خطرے سے خالی نہ ہوگی۔

کوٹھری کے دروازے پر پہنچ کر اس نے آہستہ سے آواز دی: "اختر صاحب!" اور وہ فوراً ہی دروازے کے سامنے آ گیا۔

"لیجیے! اس پیکٹ میں شامی کبابوں کے سینڈوچز ہیں۔"

"سینڈوچز کھانے کے بعد ہمیشہ کافی پیتا ہوں۔" اجنبی نے کہا اور وہ جل گئی۔ کافی پیتے ہیں لاٹ صاحب، جیسے اپنے باوا کے گھر میں براجمان ہوں۔

"دس قدم کے فاصلے پر نل لگا ہوا ہے۔" اس نے کہا۔ "اور ٹونٹی سے منہ لگا لیجیے گا۔ ہو سکتا ہے آپ کی قسمت سے کافی ہی نکل آئے۔"

"خیر! خیر کوئی بات نہیں۔ یہاں ایک مسئلہ کھڑا ہے۔ ہم اسی پوری رات بسر کریں گے۔ بستر تو ہے نہیں۔ سٹیشن پر پڑا ہوا ہے۔"

"ٹکٹ کلکٹر کتنے روپے مانگ رہا ہے؟" ساجدہ نے پوچھا۔

"ساڑھے پندرہ۔" اجنبی نے جواب دیا۔

"وہ بھی لا دیتی ہوں۔ صبح یہاں سے نکل کر اسٹیشن جائیے۔ سامان لیجیے اور جدھر سینگ سمائیں نکل جائیے۔"

"آپ کے والد صاحب ٹکٹ کلکٹر ہیں؟"

"بالکل۔"

"تو پھر وہ مجھے کہیں نہ کہیں نوکری دلوا ہی دیں گے۔"

"دماغ تو نہیں چل گیا؟"

"کیا حرج ہے اگر کسی غریب کا بھلا ہو جائے۔"

"تم جہنم میں جاؤ!" اس نے کہا۔ وہ سمجھی تھی کہ وہ پھر کچھ کہے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آخر وہ وہاں سے چلی ہی آئی۔ بیزار تو بہت ہے مستقل طور پر اسی کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔

شرارت کر بیٹھی تھی لیکن حقیقتاً اتنی دلیر بھی نہیں تھی کہ انجام کی پرواہ نہ ہوتی۔ اس سے کہیں زیادہ فکر تھی ماں اور نانی کے درمیان جھگڑے کی جو خاندانی زندگی کے لیے پریشان کن ہوتا۔

اب اس وقت پوری عمارت میں سناٹا تھا اور وہ بستر پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔

*

صفدر نے ٹرانسمیٹر پر آئے ہوئے پیغام کو جو کوڈ ورڈز میں تھا لفظ بہ لفظ درج کر لیا تھا اور اب اُسے اردو میں لکھ رہا تھا۔

... قریب ہی ساجدہ حبیب بیٹھی اُسے اس طرح گھورے جا رہی تھی جیسے اُس پیغام کا مفہوم جاننے کے لیے بے تاب ہو۔

یہ دونوں ایک ہفتے سے عادل آباد میں مقیم تھے۔ ساجدہ حبیب کی شکل کسی قدر بدلی ہوئی تھی۔ آسانی سے نہیں پہچانی جا سکتی تھی۔ اول تو اس نے اپنے بالوں کا اسٹائل بدل دیا تھا اور پھر پلاسٹک میک اپ کی مدد سے چہرے میں بھی کچھ تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ صفدر میک اپ میں نہیں تھا۔

قیام ہوا تھا عادل آباد کے سب سے بڑے ہوٹل ڈورو میں۔ اُن کے کمروں کے سامنے جوزف پہرہ دیا کرتا تھا۔

وہ یہاں ایکسٹو کے حکم سے مقیم تھے۔ ساجدہ حبیب کے متعلق یہ معلوم ہو سکا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہو گی۔ صفدر نے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تلخ لہجے میں جواب ملا تھا کہ اپنے کام سے کام رکھا جائے۔ پھر صفدر نے خود ساجدہ حبیب سے بھی پوچھنے کی ہمت نہیں کی تھی کہ وہ کون ہے اور اُن کے درمیان اُس کی موجودگی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟

البتہ اُسے یہ ضرور معلوم تھا کہ عمران یہاں کیا کچھ کرتا پھر رہا تھا اور اُسے براہ راست اُسی کے احکامات کا پابند رہنا ہے۔ ساجدہ اُسے عمران کے متعلق بور کرتی رہتی۔ وہ کہاں ہے، کب آئے گا، اس سے ملاقات کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

وہ سیکرٹ سروس والوں کے چکر میں عمران ہی کے توسط سے پہنچی تھی اور عمران ہی کے سلسلے میں انھیں دردِ سر میں مبتلا کرتی رہتی تھی۔

"کیا عمران ہی کا پیغام ہے؟" اس نے صفدر سے پوچھا۔

"نہیں!" صفدر نے جواب دیا حالانکہ وہ عمران ہی کا پیغام تھا جس نے مطلع کیا تھا کہ حیرت انگیز طور پر ٹھیک اسی کوٹھی کے سامنے والی عمارت میں رہنے کی جگہ مل گئی ہے جس کی نگرانی کا حکم ایکسٹو سے ملا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب میں کیا کروں؟" ساجدہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"کس سلسلے میں؟"

"میں کب تک اس طرح زندگی بسر کرتی رہوں گی؟"

"میں جب پوری طرح تمہارے حالات سے باخبر ہی نہیں تو کیا جواب دے سکوں گا اس سوال کا؟"

"عمران نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہمیں تمہیں اُن لوگوں سے محفوظ رکھنا ہے۔"

"کب ختم ہو گا یہ قصہ؟"

قبل اس کے کہ صفدر کچھ کہتا جوزف کی غراہٹ سنائی دی۔

"یہ کم بخت بھی مصیبت بن جاتا ہے۔" صفدر بڑبڑاتا ہوا اُٹھا اور دروازہ کھول کر کاریڈور میں نکل آیا۔

جوزف خواہ مخواہ کسی بپھرے ہوئے کتے کی طرح غرا رہا تھا۔ صفدر نے تحیر آمیز انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی بھی نہ دکھائی دیا۔ آخر اس نے جھنجھلا کر کہا: "کیا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

جوزف نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، اور بدستور غراتا رہا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی اس کے سامنے کھڑا ہو۔

"کیا بہت زیادہ پی لی ہے؟"

جوزف نے پھر اسی طرح ہاتھ اُٹھایا اور غراتا رہا۔

صفدر مضطرب سا واپس جانے کے لیے مڑ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جوزف نے غراتے ہوئے کہا: "مسمرانا کی ماں مر گئی۔" اور خاموش ہو گیا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟ تماشا بناؤ گے ہمیں بھی؟"

"آج سنیچر ہے۔۔۔" جوزف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ضرور چڑھ گئی ہے۔"

"نہیں مسٹر! سنیچر ہے اور رات کے ڈیڑھ بجے ہیں۔"

"بارہ بجے کے بعد سے اتوار شروع ہو جاتا ہے۔ مگر کس کی موت تھی؟"

"موت نہیں تھی مسٹر! آپ کے لیے اتوار شروع ہو گیا ہو گا۔ میرے لیے تو جب تک دوبارہ سورج نہ نکل آئے سنیچر ہی رہے گا۔ سنیچر کی رات مسمرانا کی حکومت ہوتی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ! اگر [illegible] ہو جانے کے بعد بھی تم [illegible] سے بچا نہیں پھر سکے۔"

"آسمانی باپ سب کو معاف کر دیتا ہے۔" جوزف نے انگلیوں سے کراس بنا کر کہا۔ "لیکن مسمرانا۔۔۔!"

"سب بکواس ہے۔"

"نہیں مسٹر! وہ اس وقت تک تم پر حاوی ہو جانے کی کوشش کرتا رہے گا جب تک تم اُلوؤں کی طرح غرا کر اُسے اس کی ماں کی موت کی اطلاع نہ دو گے۔"

"تو وہ تم پر حاوی نہ ہو سکا؟" صفدر نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہرگز نہیں!" جوزف نے پھر انگلیوں سے کراس بنایا۔ "لیکن میرے باس پر حاوی ہو چکا ہے۔"

"باس پر۔۔۔ کیا مطلب؟"

"وہ آج کل دن رات خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں دیکھتے رہتے ہیں۔"

"میرے لیے نئی اطلاع ہے۔"

"میں نے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں سنتے۔" جوزف بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا، جیسے اُسے اس بات سے گہرا صدمہ پہنچا ہو۔

"تم نے کیوں سمجھانے کی کوشش کی تھی؟"

"مسٹر!" جوزف کی آواز میں تحیر تھا۔ "اگر تمھارا باپ خوب صورت لڑکیوں کے چکر میں پڑ جائے تو تمھارے کیا جذبات ہوں گے؟"

"تو عمران صاحب تمھارے باپ ہیں؟ یہ نئی بات معلوم ہوئی آج۔"

"وہ میرے باپ کے بھی باپ ہیں۔"

"جوزف! اب تم جا کر سو جاؤ۔" صفدر نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔ "واقعی بہت زیادہ پی گئے ہو۔"

"نشہ کہاں ہوتا ہے مسٹر۔۔۔ چاہے جتنی پی جاؤں۔ ہاں میں اپنے باس کی بات کر رہا ہوں۔ جتنی شفقت مجھے اُن سے ملی ہے اپنی ماں سے بھی نہیں ملی تھی۔ سچ کہتا ہوں اُن کی عدم موجودگی میں کسی بچھڑے ہوئے بچے کی طرح بلکتا رہتا ہوں۔"

"او خدا کے بندے اب جا کر سو بھی جا۔" صفدر نے کہا اور کمرے میں چلا آیا۔

ساجدہ صفدر کے پیچھے سے داہنا شانہ نکالے کھڑی رہی تھی۔ اس کی آہٹ پر چونک پڑی۔

"یہ عمران ایسی زندگی کیوں بسر کرتا ہے؟" اس نے صفدر سے پوچھا۔

صفدر جھنجھلا گیا۔

"انھیں سے پوچھ لیا ہوتا۔ میں کیا بتا سکوں گا۔"

"میں نے اس حبشی سے بھی پوچھا تھا۔"

"پھر کیا بتایا اس نے؟"

"کچھ نہیں! مسٹر مسٹر سے منہ بنا رہا تھا۔"

"وہ قطعی پسند نہیں کرتا کہ کوئی عورت اُس کے باس کے قریب بھی آئے۔"

"کوئی آنے ہی کیوں لگی۔" ساجدہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"یہ نہ کہو! نہ جانے کتنی آئیں اور تھک ہار کر واپس چلی گئیں۔ تم نے اُس لڑکی جولیانا فٹز واٹر کو تو دیکھا ہی ہے۔۔۔"

"ہاں! تو پھر؟"

"وہ عمران کے لیے جان بھی دے سکتی ہے۔"

"اُدھر ہو گا مجھے کیا لیکن میرا مستقبل...؟"

صفدر کچھ نہ بولا۔ وہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ صفدر نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک یوریشین لڑکی کھڑی نظر آئی۔ جوزف کا کہیں پتا نہ تھا ورنہ اس کی موجودگی میں وہ دستک کیسے دے سکتی! اُسے دروازے کے قریب آنے ہی نہ دیتا۔

"میں یہ اطلاع دینے آئی ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا باڈی گارڈ لاؤنج میں بیٹھا دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے۔"

"کیا؟" صفدر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"خود جا کر دیکھ لو۔" اس نے کہا اور مسکراتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

صفدر جھپٹا۔ کمرے میں آیا اور کوٹ پہن کر پھر باہر جانے والا ہی تھا کہ ساجدہ بول پڑی۔ "کہاں چلے ہیں؟ تنہا نہیں رہوں گی۔"

"بیکار باتیں مت کرو۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔ "لاؤنج تک جا رہا ہوں۔"

لاؤنج کی طرف جاتے وقت سوچ رہا تھا کہ آخر ایکسٹو نے یہ دونوں بلائیں اس کے گلے میں کیوں لٹکائی ہیں۔ اس سے پہلے کبھی خود ایکسٹو کی طرف سے جوزف کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ اس بار کیوں اس نے باڈی گارڈ کے فرائض اس کے سپرد کیے تھے۔

لاؤنج میں پہنچ کر اس نے جوزف کے گرد بھیڑ دیکھی۔ جوزف فرش پر اکڑوں بیٹھا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور ہوٹل کے منتظمین اُسے وہاں سے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

دفعتاً اسی بھیڑ سے کسی نے کہا۔ "او وہ اس کا باس بھی آ گیا ہے۔" لوگ صفدر کی طرف متوجہ ہو گئے اور اسے جوزف تک پہنچنے کے لیے راستہ بھی دیا۔

"جوزف! جوزف!" صفدر نے اس کے شانے پکڑ کر اُسے بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا لیکن اس کے رونے کی رفتار کم نہ ہوئی۔

"جناب عالی! اسے لے جائیے یہاں سے۔ ورنہ ہوٹل کا بزنس خاک میں مل جائے گا۔" ایک منتظم نے ہانپتے ہوئے کہا۔

صفدر نے جوزف کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں اور جب صفدر نے تنگ آ کر ہاتھ اس کی بغلوں سے نکالے تو وہ فرش پر لیٹ گیا۔ لیٹا ہوا تھا۔ دھاڑیں اب بھی جاری تھیں۔ بچے کی طرح بے تحاشا روئے جا رہا تھا۔

صفدر کو ایسا لگ رہا تھا جیسے سر بازار کسی نے کپڑے اتروا لیے ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مشین کی کون سی کل دبائی جائے کہ اس کی بھوں بھوں تھمے۔

آخر اس نے بے بسی سے کہا۔ "او... جوزف... تجھے مسمرائز کیا جائے... خاموش ہو جا ورنہ خوب صورت لڑکیوں کی جوتیاں تیرے سر پر منڈلائیں گی۔"

پھر سچ مچ ایسا ہی معلوم ہوا جیسے وہ کوئی چلتی ہوئی مشین رہی ہو جس میں یک بیک بریک لگ گئی ہو۔ وہ خوف زدہ انداز میں آنکھیں پھاڑے چھت کو گھورے جا رہا تھا اور دوسرے لوگ صفدر کو گھور رہے تھے کیونکہ اس نے یہ چند الفاظ انگریزی میں کہے تھے اور دوسرے سننے والوں نے بھی انہیں صاف سنا تھا۔

"اب اٹھ بھی۔" صفدر نے کہا۔ "ورنہ مسمرائز۔"

"نہیں... نہیں...!" جوزف بوکھلا کر اٹھتا ہوا بولا۔ "آج سنیچر کی رات ہے ایسا کچھ مت بولو باس۔" اس نے سینے پر کراس بناتے ہوئے کہا اور چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

پھر صفدر نے اُسی یوریشین لڑکی کو دیکھا جس نے اس واقعے کی اطلاع صفدر کو دی تھی۔

لڑکی اس کے قریب آ کر بولی۔ "تم نے اس سے جو کچھ کہا تھا اس کا کیا مطلب تھا؟"

"مطلب...؟" صفدر نے حیرت سے کہا۔ "افریقہ کے کالے جادو کا مطلب میں کیا بتا سکوں گا۔ ایک منتر پھونکنے والے سے اسے خریدا تھا۔ اسی نے بتایا تھا یہ جادو کہ جب کوئی کل ٹیڑھی ہو جائے اسی منتر کے ذریعے سیدھی ہو سکے گی۔"

"ایسے بے وقوف آدمی کو باڈی گارڈ بنانے سے کیا فائدہ! میں نے اُسے پہلے بھی دیکھا ہے، بے تحاشا پیتا ہے۔"

"کچھ لوگ نہیں پیتے کیا؟" صفدر نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا تھا اور لڑکی بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ چل رہی تھی۔

"کچھ لوگ نہیں!" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "آخر اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ تم اتنے اخراجات برداشت کرتے ہو؟"

"بڑے کام کا آدمی ہے۔" صفدر بولا۔ "ہنسنے کے مقام پر روتا ہے اور رونے کے مقام پر قہقہے لگاتا ہے۔"

"کیا تم کسی دیسی ریاست سے تعلق رکھتے ہو؟"

"ہاں! میں راناتہور علی صندوقی کا پرائیویٹ سیکرٹری ہوں۔"

"یہ راناتہور علی کون ہے؟"

"وجیہت بڑا آدمی ہے۔ یہ جان لو جسے ابھی تم دھاڑیں مارتے دیکھ چکی ہو اسی نے پال رکھا ہے۔"

"راناتہور علی کہاں ہے؟"

"پتا نہیں! سیلانی آدمی ہیں۔ کہیں نہ کہیں ضرور ہوں گے۔"

"مجھے بے حد شوق ہے کہ کسی دیسی ریاست کے شہزادے کی سیکرٹری بنوں۔"

صفدر نے چلتے چلتے رک کر اسے غور سے دیکھا۔ وہ بھی رک گئی تھی۔ "اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ کہیں تم پہلے ہی سے تو اس نوکری کی تلاش میں نہیں تھیں۔"

"کیا مطلب؟"

"تم خواہ مخواہ مجھ سے گفتگو کے مواقع تلاش کرتی ہو۔" صفدر نے سخت لہجے میں کہا۔

"چلو یہی سہی۔" وہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی۔ "لیکن اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے؟"

"ہوں، تو تم ہماری اسٹیٹ کی ملازمت چاہتی ہو؟" صفدر نے پُر تفکر لہجے میں کہا لیکن آواز میں تلخی ابھی تک برقرار تھی۔

"یقیناً چاہتی ہوں۔"

"فی الحال کیا کر رہی ہو؟"

"میں یہاں اس ہوٹل کے ٹیلی فون ایکسچینج پر بیٹھتی ہوں۔"

"کیا یہ ملازمت پسند نہیں؟"

"اگر آزاد اور بے راہ پر اتر آؤں تو اس سے زیادہ منفعت بخش اور کوئی دوسرا کام ہو ہی نہیں سکتا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں غور کروں گا۔"

"تو پھر میں صبح کو ملوں؟" یوریشین لڑکی نے پوچھا۔

"میں خود مل لوں گا۔" صفدر نے کسی قدر لگاوٹ کے ساتھ مسکرا کر کہا۔ "تمہارے ڈیوٹی کے اوقات کیا ہیں... کیا نام ہے؟"

"ریٹا... ریٹا جبرائیل! میں یہیں رہتی ہوں۔ کمرا نمبر ستائیس۔"

"ٹھیک ہے! میں سوچوں گا کہ تمہارے لیے کہاں جگہ نکل سکتی ہے۔"

"صرف سیکرٹری شپ چاہتی ہوں۔" وہ انگلی اٹھا کر بولی۔

"اوہو... تو تم میری جگہ لینا چاہتی ہو؟"

"تمہیں وہ کوئی دوسری جگہ دے دے گا۔ مردوں کے سیکرٹری اچھے نہیں لگتے۔"

"خیر خیر... دیکھا جائے گا۔" صفدر جماہی لے کر بولا۔ "اب نیند آ رہی ہے۔"

"شب بخیر!" وہ دوسری طرف مڑتی ہوئی بولی۔ "خیال رکھنا۔"

صفدر اپنے کمرے میں جانے سے پہلے جوزف کی طرف متوجہ ہوا جو دروازے سے تین یا چار فٹ کے فاصلے پر جھک کر کسی بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

"کیا ہو گیا تھا تمہیں؟" صفدر نے پوچھا۔

"میں تمہیں جواب دینے کا نہیں ہوں مسٹر!" صرف اس کے ہونٹوں نے جنبش کی۔

"کیا مطلب؟"

"جو کچھ بھی کر رہا ہوں باس کے حکم سے کر رہا ہوں لیکن تم نے اس وقت اس منحوس ہستی کا نام لے کر میرا نشہ اکھاڑ دیا ہے۔ پچھلی بوتل میں صرف ایک چوتھائی رہ گئی ہے۔ سوچتا ہوں صبح تک کیا ہو گا؟"

"عمران صاحب نے..."

"خاموش رہو! کسی کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ ابھی وہ سفید چڑیل تم سے کیا باتیں کر رہی تھی؟"

"اس پر تو کیا میں تمہیں جواب دوں۔"

"نہیں لیکن ہوشیار رہنا۔ سفید نسل کا خون جس میں بھی ہو اس سے ہوشیار رہنا۔ یہ لوگ خواہ مخواہ وقت ضائع نہیں کرتے۔"

"مشورے کا شکریہ۔" صفدر نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور کمرے میں چلا گیا۔

◆

صبح ہوتے ہی صبیحہ پائیں باغ میں نکل آئی۔ ابھی صرف وہی ملازم بیدار ہوا تھا جس کے ذمے باورچی خانے کے انتظامات تھے۔ لہٰذا وہ باورچی خانے میں مشغول تھا۔

وہ مالی کی کوٹھری کی طرف بڑھی۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ چارپائی خالی نظر آئی اور اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ رات ہی نکل بھاگا ہو گا۔ اس نے سوچا۔ اندر ملگجا سا اندھیرا تھا۔ اس نے دروازہ کچھ اور کھول کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر دل دھک سے رہ گیا۔ چارپائی کے نیچے کون پڑا تھا جس کی ٹانگیں دوسری طرف نکلی ہوئی تھیں۔

دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا معاملہ ہے!

وہ دروازہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ آئی۔ ابھی پچھلے ہی دنوں اس نے ایک جاسوسی ناول پڑھا تھا جس میں ایک ایسے ہی اجنبی کی کہانی تھی۔ اجنبی نے کسی کے مکان میں رات بسر کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ وہاں سویا بھی تھا اور اب دوسری صبح صاحب خانہ اس

سکے کس سے ہی گیا تو اس کی گردن دھڑ سے الگ پائی تھی۔ چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اگر کسی نے اُسے قتل کر دیا ہے تو اب کیا ہوگا۔ ملازمین شہادت دیں گے کہ اس کی ماں اور نانی نے سفاکی سے پکڑوا کر بند کروایا تھا۔ انھیں اس کا علم تو نہیں ہے کہ اس نے رات ہی اُسے اسٹور سے باہر نکال کر مالی کی کوٹھری میں پہنچا دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کے حضور گڑگڑانے لگی۔ سوچ رہی تھی کہ بزرگوں کو پریشان کرنے کی سزا مل رہی ہے اُسے۔

پھر وہ اُچھل پڑی کیونکہ مالی کی کوٹھری کا دروازہ کھلنے کے ساتھ اُٹھا "گڈ مارننگ!" اجنبی کی بھرائی ہوئی سی آواز آئی۔

"تم... زندہ ہو؟" صبیحہ اس کی طرف جھپٹی۔

"ابھی تک تو زندہ ہوں لیکن اگر دس منٹ کے اندر اندر ناشتہ نہ ملا تو یہیں ڈھیر ہو جاؤں گا۔"

"تو تم ہی چارپائی کے نیچے پڑے تھے؟"

"ہاں ہاں! بالکل... کیا کرتا، میں نے سوچا جس کی چارپائی ہے اگر اس نے کروٹ سے اُٹھا دیا تو خواہ مخواہ کی بے عزتی ہوگی۔ لہٰذا کیوں نہ میں چارپائی کے نیچے ہی سو رہوں!"

"اچھا اب چلتے پھرتے نظر آؤ۔" وہ اپنا دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی بولی۔

"ناشتے کے بغیر ہی... نہیں، اتنا ظلم نہ کیجیے۔ میری جیب نہ کٹ گئی ہوتی تو کبھی نہ کہتا۔ مجھے خود ہی بھیک مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"تم یقیناً کوئی بھکاری ہی ہو۔" صبیحہ دانت پیس کر بولی۔ "مجھے اب تم سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں رہ گئی۔ تم نے ابھی مجھے ڈرا دیا تھا۔"

"میں نے؟" اجنبی نے حیرت سے کہا۔ "کب؟"

"جب تم چارپائی کے نیچے اوندھے منہ پڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھی شاید کسی نے تمھیں قتل کر دیا ہے۔"

نوجوان بوکھلا کر اپنی گردن ٹٹولنے لگا، پھر جھنجھلائی سی آواز میں بولا۔ "کیوں ڈرا رہی ہیں مجھے۔"

"بس چلے جاؤ یہاں سے۔"

"کہاں جاؤں؟" اس نے بے بسی سے کہا۔ "سامان اگر مل بھی گیا تو واپسی کا کرایہ نہیں ہے۔"

"اب ایک پائی بھی نہ دوں گی تمھیں۔"

"میں سمجھ گیا۔"

"تو پھر جاؤ۔"

"یا اللہ میں کہاں جاؤں؟" وہ اپنی پیشانی پر دو ہتڑ مار کر بلبلایا۔ "ارے میں موٹر ڈرائیوری بھی کر سکتا ہوں۔ صرف ڈبل ایم ایس سی فزکس ہی نہیں ہوں۔"

"کیا... کیا... ڈبل ایم ایس سی فزکس... تم...؟"

"ہاں! میں نے فزکس میں ریسرچ بھی کی تھی۔"

"جناب نے؟" وہ اس کے چہرے کے قریب ہاتھ نچا کر بولی۔

"جی... بالکل بالکل!"

"میٹرک تک فزکس پڑھی ہوگی۔"

"خدا غارت کرے مجھے۔" وہ غصے سے اپنا سر پیٹ کر بولا۔ "کیسے لوگوں میں آ پھنسا ہوں۔"

"تم کوئی بہت بڑے فراڈ ہو۔"

"مجھے کب انکار ہے اس سے لیکن میٹرک ویٹرک کی بات تو نہ کرو۔"

"تمھیں اعتراف ہے کہ تم فراڈ ہو۔"

"بالکل ہے۔ جو کچھ بھی ہو تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میری بات سنو، میں دنیا میں صرف تین کام کر سکتا ہوں۔ سائنس کی ریسرچ، یا موٹر ڈرائیوری یا پھر بھیک مانگ کر گزارا کر سکتا ہوں۔"

"تو یہاں تم پروفیسری کی تلاش میں وارد ہوئے تھے یا موٹر ڈرائیوری کی؟"

"کسی کے لیے بھی آیا ہوں لیکن اب تو بھیک مانگ رہا ہوں۔"

"وہ بھی نہیں ملے گی۔ اب چلتے ہی جاؤ ورنہ نوکروں کو بلاتی ہوں۔"

"چلا جاؤں گا لیکن جاؤں کہاں؟"

"تلاش کرو جا کر اپنے چودھری عبداللطیف کو۔"

"کوئی تدبیر بتائیے ایسی کہ اس تک پہنچ سکوں۔"

"سر کے بل کھڑے ہو کر سوچو، شاید یاد آ جائے۔"

"بہت اچھا۔" بڑی سادگی سے کہا گیا۔

اور پھر صبیحہ نے دیکھا وہ سچ مچ سر کے بل کھڑا ہو گیا ہے۔

"ارے ارے... یہ کیا حرکت ہے؟" صبیحہ بوکھلا کر چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ اتنا الو کا پٹھا بھی ہو سکتا ہے کوئی۔ اس کی یہ حرکت دور سے بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا۔" اجنبی نے اسی طرح سر کے بل کھڑے کھڑے کہا۔

"تم بھکاری ہی نہیں مداری بھی ہو۔" صبیحہ دانت پیس کر بولی۔ "سیدھے ہو جاؤ ورنہ اب میں ہی تمھیں چور بتا کر شور کر دوں گی۔"

"ارے... جی... بات یہ ہے۔" وہ سیدھا ہوتا ہوا بولا۔ چند لمحے صبیحہ کو گھورتا رہا پھر بولا۔ "اب مجھے بھی غصہ آ جائے گا۔"

"تو کیا بگاڑ لو گے تم میرا؟"

"چیختا پھروں گا سارے شہر میں کہ میں اختر ہوں۔ ڈپٹی صاحب کی قرۃ العین صبیحہ نے خط لکھ کر مجھے بلوایا تھا۔ رات بھر اسٹور میں بند رکھا اور اب ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ دو اللہ کے نام پر۔"

"اگر تم نے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کی تو جہنم میں جھونک دیے جاؤ گے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں!"

"میں کہتی ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔"

"میں کہتا ہوں ناشتا لاؤ۔ نہیں تو یہیں کھڑے ہو کر چیخنا شروع کر دوں گا کہ اسٹور روم سے نکال کر اس کوٹھری میں بند رکھا تھا۔"

"تم عجیب آدمی ہو!"

"عجیب ترین کہو۔ موٹر ڈرائیوری ہی دلوا دو کہیں، ایسے ایسے کرتب دکھاؤں گا کہ جی خوش ہو جائے گا۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"فی الحال ناشتا اور اس کے بعد نوکری لیکن نوکری [illegible] وہ دوسر گر نہ ملے گی۔ پچھلے مہینے ایک جگہ انٹرویو میں گیا۔ وہاں ایک کاٹھ کا گھوڑا رکھا ہوا تھا جس پر بیٹھ کر بچے کھیلتے ہیں۔ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا یہ کیا ہے۔ میں نے کہا کاٹھ کا گھوڑا۔ انھوں نے پھر پوچھا اگر اس پر کوئی تم جیسا آدمی بیٹھا ہوا نظر آئے تو تم پر اس کا کیا ردِعمل ہوگا؟ میں نے کہا پہلے یہ بتائیے ردِعمل کسے کہتے ہیں۔ بس اسی کشمکش کو دیکھتے ہوئے انھوں نے مجھے اس حال میں دیکھ کر کاٹھ کا الو سمجھ بیٹھے ہوں گے۔ جلد انٹرویو تو وہیں کا وہیں ختم ہو گیا اور میں اگلی رات تک برابر نوکری کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"قیامت تک کرتے رہو گے۔ تم تو خود ہی کوئی جیب کترے معلوم ہوتے ہو۔ خواہ مخواہ جیب کٹ جانے کی کہانی لے بیٹھے۔"

"اچھا اچھا بھلا کہا ہے!" اجنبی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "اگر کسی نے مجھے اسٹور روم کی بجائے یہاں دیکھ لیا تو تمھاری کیا پوزیشن ہوگی... اچھا تا تا!" اس نے جھپٹ کے کوٹھری میں گھس کر اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

صبیحہ دانت پیستی رہ گئی۔ شدت سے غصہ آ رہا تھا اس کے گھر میں کوئی جیالا آدمی ہوتا تو ایسی باتیں اُسے ورغلا سکتی تھیں لیکن یہاں تو اس طرح جان کی بن آئی ہوئی تھی جیسے کان پر چلنے والی جوں تک جلا دی گئی ہو۔

پھر اب وہ کیا کرے، کس طرح اس بلا سے پیچھا چھڑائے۔ اُس نے یہی سوچا یہ بات بڑے پتے کی بھی تھی کہ اگر وہ اسٹور روم کی بجائے وہاں پایا گیا تو خود صبیحہ کا کیا حشر ہوگا۔

وہ جھلا کر دروازہ پیٹنے لگی اور وہ اندر سے بولا۔ "بابا کے نام پر تنگ میں بیمار ہوں گا۔"

"اے موذی... خبیث نکلو باہر ورنہ...!" وہ دانت پیس کر بولی۔

"ناشتہ لاؤ!" اندر سے آواز آئی۔

"خدا غارت کرے تمھیں سور کہیں کے!"

"چلو یہی دعا مانگو۔ میں بھی اس دکھ بھری زندگی سے نجات کا خواہاں ہوں۔"

"مرو گے، اللہ نے چاہا تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گے۔"

"تھوڑی دیر اور ناشتہ نہ ملا تو تمھاری بددعاؤں کے بغیر ہی یہ سب کچھ ہو جائے گا۔"

صبیحہ نے سوچا۔ اس موذی کو اب مزا ہی چکھانا چاہیے۔ تنتناتی ہوئی سیدھی باورچی خانے کی طرف آئی۔ یہاں ملازم ناشتہ تیار کر چکا تھا۔ کچھ سینڈوچ بھی بنا لیے تھے، ساتھ ہی بڑی بی کے لیے دلیا بھی تیار کر رکھا تھا۔

اُس نے اس سے کہا کہ تھرماس میں چائے بھر دے اور کچھ سینڈوچ بھی پیک کر دے، وہ باہر جائے گی۔

پھر اس نے گیراج سے گاڑی نکالی اور ناشتے کا سامان لینے پھر باورچی خانے میں آئی۔ باورچی نے ناشتے کی چیزیں تیار کر دی تھیں۔

صبیحہ سوچ رہی تھی کہ آج اس کمبخت کو سارا دن بھوکا مارا جائے۔ کیوں نہ وہ مالی کی کوٹھری کو باہر سے مقفل کر دے۔ شاید ہی کوئی ادھر دھیان دیتا ہو۔ دروازے میں قفل دیکھ کر کسی کو بھی اس نئی تبدیلی کا احساس نہ ہوگا۔ وہ شور تو مچانے سے رہا۔ چوں بھی کی تو آفت بن جائے گی۔ اب اتنا بھی احمق نہ ہوگا کہ اتنی موٹی سی بات سمجھ میں نہ آ سکے۔

بہرحال اُس نے مالی کی کوٹھری مقفل کر دی۔ جلدی میں تھی۔ اکثر صبح کا ناشتا شہر سے باہر کسی ویرانے میں کرتی تھی۔ ایسے مواقع پر کار خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ ویسے بھی آج کل کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب کو ڈرائیور کی تلاش تھی لیکن ابھی تک کوئی معقول آدمی نہیں ملا تھا۔ بہت آزاد خیال تھے لیکن نہ جانے کیوں ڈرائیوری کے لیے بوڑھے آدمی کی تلاش تھی۔ صبیحہ کئی بار اس مسئلہ پر اُن سے بحث بھی کر چکی تھی لیکن وہ ادھر اُدھر کی باتوں

میں اٹکا جاتے۔

اُفق کی گہری سرخی میں جھٹپٹا پن آ چلا تھا اور صبیحہ کی کار ویرانوں کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ عادل آباد بہت بڑا شہر نہیں تھا۔ ڈیڑھ میل چلنے کے بعد ہی سے ہرے بھرے کھیتوں کے سلسلے شروع ہو گئے تھے۔

دفعتاً عقب نما آئینے میں سُرخ رنگ کی ایک اسپورٹ کار نظر آئی اور اُسے یک لخت غصہ آ گیا۔

"سُور کا بچہ!" وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑائی۔

وہ جب بھی اس طرح تنہا گاڑی لے کر باہر نکلتی وہ مردود تعاقب شروع کر دیتا تھا لیکن آج تک چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی۔ جہاں وہ ٹھہر کر ناشتا کرتی تھی اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر وہ بھی اپنی کار روک دیتا یا خود بھی ناشتا کرتا یا سگار سلگا کر بیٹھا رہتا۔

اس سے ڈیڈی صاحب بھی خائف رہتے تھے لہٰذا وہاں بھی سے شکایت کر کے اس کا کیا بگاڑ لیتی۔ ڈیڈی صاحب بھی اُس سے اس لیے ڈرتے تھے کہ وہ ڈویژن کے کمشنر کا سالا تھا۔

وہ اُن کے بنگلے کے سامنے والی کوٹھی میں رہتا تھا۔ وہاں عورتیں نہیں تھیں لیکن کبھی کبھی نظر ضرور آ جاتی تھیں جو ملازمائیں ہی لگتی تھیں۔

بھدا سا آدمی تھا البتہ جسم اعضا مضبوط تھے۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے کسی بھینسے کو پہلوانی کا شوق چرایا ہو۔

آج بھی اُس نے کچھ آگے بڑھ کر اپنی اسپورٹ کار روکی تھی۔ صبیحہ گاڑی سے باہر نکلی۔ وہ اُس سے خائف نہیں تھی۔ اس کی بجائے کوئی اور لڑکی ہوتی تو ایک بدمعاش کے تعاقب کے ڈر سے ادھر آنا چھوڑ دیتی لیکن صبیحہ نے اپنی روش نہیں بدلی تھی۔ اب تو اُسے ضد ہو گئی تھی۔ چاہتی تھی کہ کبھی وہ کچھ بولے اور وہ اس کی گردن دبا بیٹھے۔ اُس نے سوچا آج گاڑی سے باہر نہیں نکلے گی۔ شاید اسی پر وہ کچھ بولے۔ صبیحہ کو اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ یہاں اس ویرانے میں ان دونوں کے علاوہ دور دور تک کسی تیسرے وجود کا پتا نہیں تھا۔ اگر اُس نے کچھ شروع ہی کر دیا تو کیا ہو گا!

دفعتاً اُس نے دیکھا کہ وہ اپنی گاڑی بیک کر کے اسی طرف آ رہا تھا۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے وہ اس کی اسپورٹ کار کو گھورتی رہی۔

پھر اُس کی گاڑی اس کے برابر ہی آ گئی اور صبیحہ کا دل دھک سے ہو گیا۔ ایک بہت بڑا چاقو اُس کی گود میں کھلا پڑا تھا۔

اب اُسے احساس ہوا تو وہ ایک زبردست غلطی کر رہی ہے۔ اب اگر اس ویرانے میں وہ کچھ شروع کر دے تو اُس کا کیا بگاڑ سکے گی۔ اُس نے اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

اب اُسے خود پر غصہ آنے لگا۔ آخر اُس نے اس ضد بندی کے سلسلے میں اس پہلو پر غور کیوں نہیں کیا تھا۔ وہ کیا بگاڑ سکے گی اُس کا۔ جسمانی قوت اُس سے زیادہ تو ہے بھی نہیں۔ شاید اُن دنوں ستارے ہی گردش میں تھے۔ ہر معاملے میں منہ کی کھانی پڑ رہی تھی۔

اُس نے گاڑی اُس کی گاڑی کے برابر روک کر انجن بند کر دیا۔

اُس کی طرف مڑا اور صبیحہ نے اُس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ دیکھی۔ سوجی سوجی آنکھوں کے سائے میں وہ مسکراہٹ اتنی خوفناک تھی لیکن صبیحہ بھی ہمت کر کے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اُس چاقو کی طرف بھی دیکھتی جو اس کی گود میں پڑا چمک رہا تھا۔

دفعتاً اس نے صبیحہ کے چہرے سے نظر ہٹائی اور اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھی ہوئی چھابی سے ایک سینڈوچ نکالا اور خاموشی سے کھانے لگا۔

صبیحہ بھی چونکی۔ زندگی میں شاید پہلی بار وہ اتنی خوف زدہ ہوئی تھی اور اُس نے اسٹارٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اسپورٹ کار سے آواز آئی "اسے بھی دیکھو!"

صبیحہ نے چونک کر دیکھا۔ اُس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بڑا سا ریوالور نظر آیا۔

"چاروں پہیے... بیکار کر دوں گا۔ ذرا آگے بڑھ کر تو دیکھو!"

لعنت ہے ایسی ضدی طبیعت پر! اُس نے دل ہی دل میں لرزتے ہوئے سوچا۔ اب بھلا اس میں ضد بندی کی کیا ضرورت تھی۔ اگر اُس نے ایک آدھ بار تعاقب کیا تھا تو ادھر آنا ہی چھوڑ دیتی۔ ایسا کرتی تو زندگی کے معاملات میں کیا فرق پڑ جاتا۔ پچھلی رات اختر کے معاملے میں پریشان ہوئی تھی تو آج صبح ہی سے تنہا ہی رہنا چاہیے تھا لیکن یہ دوسری حماقت سرزد ہو گئی۔

وہ ایک ٹک اس خوفناک ریوالور کو دیکھے جا رہی تھی کہ دفعتاً پشت سے ایک ہاتھ ریوالور پر پڑا اور ساتھ ہی ریوالور والے کے سر پر ایک میلا سا کپڑا آ گرا۔

اُس نے یہ بھی دیکھا کہ ریوالور اُچھل کر گاڑی کے پیچھے آ گرا ہے۔ ایک تیسرا آدمی اس نامعقول آدمی کو دبوچے ہوئے تھا۔ وہ اس کی صورت نہ دیکھ سکی کیونکہ پشت اسی کی طرف تھی۔ پھر جب وہ اس کی طرف مڑا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ تو وہی پچھلی رات والا لفنگا تھا جسے وہ ملازم کی کوٹھری میں بند کر کے قفل لگا آئی تھی۔ اُس نے جھک کر ریوالور اُٹھایا اور اسے تعاقب کرنے والے کی گردن سے لگائے کہہ رہا تھا۔ "دوسری طرف گھوم جاؤ اگر ادھر سے تو گولی مار دوں گا۔"

دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کی گود میں پڑا ہوا چاقو بھی اُٹھا لیا تھا۔

صبیحہ نے دیکھا کہ اُس نے وہی میلا کپڑا جو اُس نے اس کے سر پر ڈالا تھا گردن میں اس طرح باندھ دیا ہے کہ سر اور چہرہ چھپ کر رہ گئے ہیں۔

"اب کرو ناشتا!" اس نے صبیحہ کی طرف مڑ کر کہا۔

اور وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اجنبی نے بھی احمقانہ انداز میں دانت نکال دیے۔

"تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟" اُس نے اپنی گاڑی سے اُترتے ہوئے پوچھا لیکن احمق نے بائیں آنکھ دبا کر اُسے اس سلسلے پر کچھ کہنے سے باز رہنے کا اشارہ کیا۔

صبیحہ کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس اجنبی کو عرصے سے جانتی ہو۔

اجنبی نے ریوالور اور چاقو صبیحہ کی گاڑی میں ڈال دیے اور تعاقب کرنے والے کے سر پر سے وہ کپڑا ابھی کھینچ لیا لیکن اجنبی دوسری جانب مڑا کھڑا رہا۔

"اب تم ادھر دیکھ سکتے ہو!" اجنبی نے احمقانہ انداز میں خوش ہو کر کہا۔

وہ اُس کی طرف مڑا اور اُس کے ہاتھ میں ریوالور نہ دیکھ کر شیر ہو گیا۔ گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے ٹیک لگا کر چھلانگ لگائی اور اجنبی پر جھپٹ پڑا۔ صبیحہ ڈری ڈری سی آوازیں نکالتی ہوئی ایک طرف ہٹ گئی۔ تعاقب کرنے والا اس کی دانست میں اس احمق نوجوان سے کہیں زیادہ مضبوط اور طاقت ور تھا۔

دونوں اُلجھے ہوئے زمین پر آ گئے۔ پھر صبیحہ نے دیکھا کہ احمق تڑپ کر اُس کی گرفت سے نکل گیا ہے۔

اس کے بعد اُس نے اُسے بھی زمین سے اُٹھ جانے کی مہلت نہیں دی۔ بس ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا اور تعاقب کرنے والا کسی بے بس بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا بلبلا رہا تھا۔ اپنی پوزیشن تبدیل کیے جا رہا تھا لیکن شاید ہی اجنبی کی کوئی ٹھوکر خالی گئی ہو اور مزہ تو یہ ہے کہ اس کے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات نظر آتے جیسے وہ اسے ٹھوکریں مار کر پچھتا رہا ہو۔ بے حد شرمندہ ہو اپنی حرکت پر جو غیر شعوری طور پر سرزد ہوتی چلی جا رہی ہو۔

مار کھانے والے کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اُس کے چہرے پر پھیل رہا تھا اور بار بار اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا۔

"بس کرو... اب بس کرو!" صبیحہ گھگھیاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"چلو بس ہو گئی!" اجنبی پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔

پٹنے والا اوندھے منہ پڑا تھا۔

وہ دونوں خاموشی سے اُسے دیکھتے رہے۔ خون دیکھ کر صبیحہ پہلے سے بھی زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ دفعتاً اجنبی روہانسی آواز میں بولا "ارے اس ورزش کی وجہ سے تو مجھے بھوک اور زیادہ چمک اُٹھی ہے!"

صبیحہ نے گھگھیاتے ہوئے انداز میں ناشتے کی چھابی پچھلی سیٹ سے اُٹھائی اور اُس کی طرف خاموشی سے بڑھا دی۔

اُس نے بیک وقت دو تین سینڈوچ نکال لیے اور ایک سینڈوچ منہ میں رکھتا ہوا زخمی آدمی کو پُرتشویش نظروں سے دیکھنے لگا۔

صبیحہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خود اُسے دیکھ رہی تھی۔ آخر کس قسم کا آدمی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو سینڈوچ کھانے کی بجائے یہاں سے چپ چاپ کھسک جانے کی فکر کرتا کیونکہ پٹنے والا بہت زیادہ زخمی بھی ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ منہ چلاتے چلاتے رُکا اور اُس سے بولا "ہوش میں آنے کا انتظار کرو گی یا چلتے پھرتے نظر آئیں؟"

"میں کہتی ہوں اب چلو یہاں سے اگر کوئی آ گیا تو... یہ کمشنر کا سالا ہے!"

"تبھی اتنا کالا ہے!" وہ سر ہلا کر بولا۔

"جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ!"

"اسے یہیں چھوڑ جاؤ گی؟"

"نہیں تو پھر کیا خود ہی اسپتال پہنچائیں گے؟" وہ جھنجھلا کر بولی "چلو جلدی کرو!"

"ٹھہرو!" اجنبی نے اسپورٹس کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ بونٹ اُٹھا کر کچھ دیر انجن پر جھکا رہا۔ پھر بونٹ گرا کر صبیحہ کی گاڑی کی طرف آیا۔ ریوالور اور چاقو پچھلی سیٹ پر پڑے تھے انہیں اُٹھا کر رومال سے صاف کیا اور زخمی کی گاڑی میں ڈال کر پھر پلٹ آیا۔ اس بار وہ سیدھا صبیحہ کی گاڑی کے اسٹیئرنگ پر جا بیٹھا تھا۔

"کیا مطلب؟" صبیحہ آگے بڑھتی ہوئی بولی "تم ڈرائیو کرو گے؟"

"بالکل! یہ بھی دیکھو کہ ڈرائیور کیسا ہوں؟"

صبیحہ چپ چاپ پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ وہ سوچ رہی تھی شاید وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کو کہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

"کہاں چلوں؟" اجنبی نے پوچھا۔

"میں تو کہہ رہی تھی کہ... یہیں..."

"اُسے چھوڑو! ہوش آگیا تو اس کی قسمت، ورنہ آیا تو گیدڑ بھگو بھی لیں گے۔ آخر تمہیں بھی تو جھک نکلنی ہی ہے۔"

"یہ... یہ... دراصل... ڈویژنل کمشنر کا سالا ہے۔"

"چلو کسی سسرال کا کمشنر ہی ہو جائے۔"

"تم سنو تو سہی۔"

"سناؤ!" اجنبی جھلائے ہوئے انداز میں پلٹ پڑا۔

"ہمارے بنگلے کے سامنے رہتا ہے۔"

"اچھا تو پھر؟"

"تم سمجھے کیوں نہیں۔ میرے والد ڈپٹی کلکٹر ہیں۔"

"بہت سی لڑکیوں کے والد ڈپٹی کلکٹر ہوں گے پھر میں کیا کروں؟"

"مطلب یہ کہ وہ ڈویژنل کمشنر کے ماتحت ہیں اور یہ اُن کا سالا...؟"

"ہو گا سالا!"

"اچھا... چلو!" وہ مُردہ سی آواز میں بولی۔ ساری شوخی اور خود اعتمادی دھری رہ گئی تھی۔ اب تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے اس اجنبی کی غلامی کرتی چلی آئی ہو!

گاڑی چل پڑی اور صبیحہ نے کچھ دیر بعد اُسے مخاطب کیا۔

"میں تو کوٹھری کو مقفل کر آئی تھی۔"

"اب بھی مقفل ہی ہو گی۔"

"کیا مطلب؟"

"میں کیا جانوں... کیا مطلب؟"

"اسے تم کوٹھری سے نکلے کیسے تھے؟"

"جب تم گاڑی گیراج سے نکال کر اندر چلی گئی تھیں تو میں باہر نکلا تھا۔ ڈکی اُٹھائی تھی اور اندر... ڈکی کے بیچ مقفل ہی چلے گئے۔"

"اوہ! تو میں نے کوٹھری میں اس وقت قفل لگایا تھا جب تم اندر نہیں تھے۔"

"یہی بات رہی ہو گی۔"

"تم نے ابھی تک مجھ سے اس آدمی کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔"

"کیا ضرورت ہے۔ مجھے تو نوکری چاہیے۔ ذرا تھوڑی سی بھی کبھی وہ میرے ہونے والے سالے تو مجھے ذبح ہی کر ڈالیں گے۔"

"مگر تم میرے یہاں کیسے ڈرائیوری کرسکو گے۔ تمہیں تو سب جانتے ہیں!"

"مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔" اجنبی نے عقب نما آئینے کی پوزیشن کسی قدر بدلتے ہوئے کہا۔ صبیحہ کی نظر آئینے پر پڑی اور وہ دم بخود رہ گئی۔

"یہ کون ہے؟ آئینے میں کس کی شکل نظر آرہی ہے؟ وہ، اجنبی تو نہیں ہوسکتا جسے پچھلی رات اسٹور روم میں بند کردیا گیا تھا، ابھی کچھ دیر پہلے جس نے اُسے اس موذی سے نجات دلائی تھی۔

وہ تو بڑا خوب رُو تھا۔ یہ کون ہے۔ پھولی پھولی ناک والا، گھنی مونچھیں جن کے نیچے ہونٹ بھی بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔

"مجھے پہچانا؟" اجنبی نے بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم... تم... ہی کون ہو؟"

"نہیں پہچانا۔ جب تم نہیں پہچان سکیں تو دوسرے کیا پہچانیں گے؟"

"تم کون ہو؟" صبیحہ پر دوسری بار خوف مسلط ہو گیا۔

"میں وہی اختر ہوں جس نے رات چارپائی کے نیچے گزاری تھی۔"

"لیکن یہ ناک... یہ مونچھیں؟"

"بھیک مانگنے کے لیے ایک آدھ شعبدہ جیب میں پڑا ہی رہتا ہے۔ تم دل جاتیں اس طرح تو اسٹیشن سے سامان ڈھونے کے لیے بھیک ہی تو مانگنی پڑتی۔ اس طرح آسانی ہوتی ہے کہ ایک گلی میں بھیک مانگی اور دوسری گلی میں اکڑتا پھرا۔ ہٹ جاؤ! اجنبی اختر صاحب جا رہے ہیں۔"

"بہت تیز چلا رہے ہو گاڑی۔"

"فکر نہ کرو۔"

"تو تم اس طرح بھیس بدل کر ہمارے یہاں ملازمت کرو گے۔"

"بالکل بالکل!"

"اگر کبھی کسی کو شبہ ہو گیا تو...؟"

"نہیں ہو گا۔ ہو جائے تو میرے منہ پر تھوک دینا۔"

"میں سخت اُلجھن میں پڑ گئی ہوں۔"

"پڑی رہو!" اُس نے لاپروائی سے کہا۔

"اس کے لیے نہیں!" وہ جھنجلا گئی۔ "میں تو اس کے لیے کہہ رہی تھی جسے مارپیٹ آئے ہو۔ اگر مر گیا تو کیا ہو گا؟"

"مسلمان ہوا تو دفن کر دیا جائے گا۔ ہندو ہوا تو شمشان کے حوالے۔"

"اوہ... تم سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ بہت برا ہوا!"

"تو کیا وہ سب مذاق تھا۔ وہ ریوالور، وہ چاقو؟"

"پتا نہیں کیا تھا؟" صبیحہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

"کیا پہلے بھی تعاقب کرتا رہا ہے؟"

"میں جب بھی اس طرح نکلتی ہوں وہ ضرور تعاقب کرتا ہے۔"

"اوہ! تب تو ٹھیک ہے۔ تم خود ہی اُس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہو۔"

"قطعی غلط! محض ضد میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ میں اسے دکھانا چاہتی تھی کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"اور نہیں بگاڑ سکا... کیوں؟"

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس حد تک بڑھ جائے گا۔"

"آئندہ سوچ لیا کرنا۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ تھوڑی دیر بعد اجنبی نے پوچھا۔ "تو تم یہ سب کچھ دوسروں کی ضد میں کیا کرتی ہو؟"

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"پھر والد سے مجھے اپنے یہاں ملازم نہ رکھوانا۔"

صبیحہ ہنس پڑی۔ پھر یک بیک سنجیدہ بھی ہو گئی۔ وہ مستقل طور پر زخمی آدمی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ اب تو وہ کھلم کھلا دشمنی پر کمربستہ ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اُسے بدنام کرنے کی بھی کوشش کرے۔ اس مارپیٹ کی رپورٹ تو درج کرانے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اگر ایسا ہوا بھی تو وہ رپورٹ کسی نامعلوم فرشتے ہی کے خلاف ہو گی۔

"پھر کیا رہی میری نوکری کی!" کچھ دیر بعد اجنبی نے پوچھا۔

"ہو جائے گی۔" اُس نے مُردہ سی آواز میں کہا اور عقب نما آئینے میں دیکھنے لگی۔ اجنبی کی پھولی پھولی سی ناک اور گھنی مونچھیں بڑی کریہہ لگ رہی تھیں۔

"تو پھر میں سیدھا گھر ہی چلوں نا؟"

"ہاں! ہاں! میں کہہ دوں گی راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ اگر یہ آدمی مدد نہ کرتا تو گھر تک نہ پہنچ سکتی۔ پھر یہ کہ ڈرائیور اور اعلیٰ درجے کا مکینک ہے۔ بیکار ہے آج کل بے چارا۔ کیوں نہ اسے ہی ملازم رکھ لیا جائے۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"لیکن تم وہی رات والے کپڑے پہنے ہوئے ہو۔"

"ان کا حلیہ بھی بدل کر رکھ دوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

جوزف ریٹا بھرائیل کو کھا جانے والے انداز میں گھور رہا تھا۔ غصے کے مارے آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں اور ہونٹ معمول سے زیادہ موٹے اور اُبھرے ہوئے لگتے تھے۔

"میں کہتی ہوں سیکرٹری کو میری آمد کی اطلاع دو۔" ریٹا نے بھی غصیلے لہجے میں کہا۔

"جاؤ... چلی جاؤ... اندر دوسری لڑکی موجود ہے۔"

"کیا بکتا ہے؟"

"آدمیوں کی طرح بات کرو۔ ورنہ تمہاری ہڈیاں زندگی بھر دُکھیں گی۔"

اتنے میں صفدر بھی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"اس بدتمیز کو سمجھاؤ۔" ریٹا اُسے دیکھ کر چیخ پڑی۔

"سفید کتیا! شاید زندگی سے بیزار ہو گئی ہے تو۔" جوزف نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"جوزف!" صفدر نے اُسے للکارا اور اُس کا پھیلا ہوا ہاتھ جوں کا توں رہ گیا۔

"میں تمہیں مزا چکھاؤں گی۔" وہ صفدر کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے جوزف کو گھونسہ دکھا کر بولی۔ لیکن جوزف پتھر کے بُت کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ ہاتھ ابھی تک اُسی طرح پھیلا ہوا تھا اور پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" صفدر ریٹا کی طرف مڑا۔

"تم سے ملنے آئی تھی۔ مگر تو ایسے بدتمیز آدمی..."

"اسے چھوڑو۔ کیا بات ہے؟"

"اوہ! یہاں سبھی ایک جیسے ہیں۔" وہ اُس کے کمرے کی طرف دیکھ کر بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ جوزف ہاتھ نیچے گراؤ۔"

جوزف مشینی انداز میں "آمین شیں" ہو گیا اور ریٹا کو ساتھ ہنسی آگئی۔ جوزف صرف آنکھوں کو جنبش دے کر اُسے گھورتا رہا۔

"آؤ!" صفدر نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

ریٹا اندر داخل ہوئی۔ صفدر اس کے پیچھے تھا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" وہ چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"کس کی تلاش ہے؟"

"کسی کی بھی نہیں۔ اُس کالے نے کہا تھا تم اندر نہیں جا سکتیں، پہلے سے ایک لڑکی موجود ہے۔"

"اوہ! وہ میری سیکرٹری کے بارے میں کہہ رہا ہو گا۔"

"تمہاری سیکرٹری؟"

"ہاں! یہاں تو سیکرٹریوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ میں بطور ملازمت رانا صاحب کا سیکرٹری ہوں۔ وہ میری سیکرٹری ہے اور اس کا سیکرٹری فی الحال جوزف ہے۔ چونکہ وہ حبشی ہے اس لیے اس کے سیکرٹری کی ابھی جگہ ہی خالی ہے اور اس کے بعد کے بھی بقیہ سیکرٹری موجود ہیں۔ بیٹھو تم کھڑی کیوں ہو؟"

"تو گویا میں براہِ راست رانا صاحب کی سیکرٹری بن گئی؟"

"ناممکن... قطعی ناممکن... تو آپ مجھ پر ڈانٹ لگانے بیٹھی ہیں؟"

"کیا یہ ضروری ہے کہ براہِ راست ایک ہی سیکرٹری ہو؟"

"ضرور... محترمہ، آپ براہِ راست ہمارے معاملات میں دخیل ہونے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

"نہ جانے کیوں اپنائیت محسوس کرتی ہوں۔"

"ذرا آہستہ!" صفدر نے چاروں طرف چور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"م... میری سیکرٹری!" اس کا لہجہ خوف زدہ تھا۔

"ارے کیوں، اوہ بھی... یہ بات ہے۔ سیکرٹری کیوں، مسٹریس ہوگی تمہاری۔"

دفعتاً دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور جوزف جھومتا ہوا اندر گھس آیا۔ ایڑیاں بجائیں اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا بات ہے؟" صفدر بُری طرح جھنجھلا گیا۔

"اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔"

"باہر جاؤ۔"

"ہرگز نہیں۔ میں باڈی گارڈ ہوں۔"

"باہر ٹھہرو۔" صفدر گرج کر بولا۔

"ہرگز نہیں جناب! میں باس کو جواب دہ ہوں۔"

"کس باس کی بات کر رہے ہو؟" ریٹا نے آہستہ سے پوچھا۔

"رانا صاحب کی۔" صفدر نے بھرائی ہوئی سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

اُسے حقیقتاً غصہ آ گیا تھا کیونکہ جوزف کے "باس" سے عمران مراد تھی۔ کیا عمران نے اُسے اس قسم کی چوکیداری پر لگایا ہے؟ وہ سوچتا اور تاؤ کھاتا رہا۔ اس سے پہلے تو اس نے کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

"تم کیا سوچنے لگے؟" ریٹا بولی۔ "کیا تم اس سے خائف ہو؟"

"قطعی نہیں، یہ مجھے اپنے پالتو کتے کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔"

صفدر کے بولنے سے پہلے ہی جوزف بول پڑا۔

"میں تم سے بات نہیں کر رہی۔" ریٹا نے جھنجھلا کر کہا۔

"یہاں تم میرے علاوہ کسی اور سے بات نہیں کر سکتیں۔"

"تم سن رہے ہو؟" وہ جھنجھلا کر صفدر کی طرف مڑی جو سر جھکائے سگریٹ سلگا رہا تھا۔

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے اختیارات کتنے وسیع ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"رانا صاحب ایک خارش زدہ کتے کو بھی مجھ پر حاکم بنا سکتے ہیں۔"

"تب تو یہ ملازمت میرے لیے قطعی فضول ہوگی۔"

"ہاں ہاں! بالکل فضول ہوگی۔ تم جاؤ یہاں سے۔" جوزف ہاتھ ہلا کر بولا۔

"حد ہوتی ہے۔" ریٹا پیر پٹخ کر چیخ پڑی۔ "میں تمہیں دیکھ لوں گی، کالے خبیث!"

جواب میں جوزف نے بھی اُسے کُتیا کی بچی کے خطاب سے نوازا اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

صفدر جوزف کو قہر آلود نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

جوزف بھی واپس جانے کے لیے اباؤٹ ٹرن ہوا۔

"ٹھہرو!" صفدر غرایا اور جوزف آگے بڑھنے کی بجائے وہیں تھم گیا۔

"کیا حرکت تھی تمہاری؟" صفدر نے پوچھا۔

"باس کا حکم!" جوزف نے اس کی طرف مڑے بغیر جواب دیا۔

"بکواس ہے۔"

"یقین کرو یا نہ کرو۔ میں مجبور ہوں۔"

"کیا کہا گیا تھا تم سے؟"

"یہی کہ کسی اجنبی لڑکی کو تمہارے قریب نہ آنے دوں۔"

"میں تمہیں برخاست بھی کر سکتا ہوں۔"

"یہ بھی جانتا ہوں۔"

"پھر؟"

"باس کا حکم!"

"یہ قطعی جھوٹی بکواس ہے۔ تم اب ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔"

"دوسری بار اس سے بھی زیادہ برا رویہ اختیار کروں گا۔ وہ تمہارے قریب تو آ کر دیکھے۔"

"میں تمہارے جبڑے توڑ دوں گا۔"

"وہ پہلے ہی سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ایک بار اور سہی... مگر ان جبڑوں کو دوبارہ سیٹ کر لینے کی مشق ہے مجھے۔"

صفدر کا غصے کے مارے برا حال ہو گیا۔

"ابے تو تو خود کو کیا سمجھتا ہے؟" وہ گھونسا تان کر اس کی طرف جھپٹا اور جوزف نے بڑے خاکسارانہ انداز میں دانت نکال دیے۔ اور پھر اس طرح صفدر کے حملے روکتا رہا جیسے کوئی معمر آدمی کسی بچے کو بہلا رہا ہو۔ خود اس نے ایک بار بھی صفدر پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ صفدر نے ذرا ہی دیر میں مکا بازی کے سارے گر آزما ڈالے اور بری طرح ہانپنے لگا۔

"بس کرو ماسٹر!" جوزف برا سا منہ بنا کر بولا۔ "اس قسم کی ورزشیں میرا نشہ اکھاڑ دیتی ہیں۔ بچو تو بوتلوں میں پیدا نہیں ہوتا۔"

"نکل جاؤ... نکلو... خبیث!" صفدر دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا کر دہاڑا۔

جوزف دانت نکالے ہوئے دروازے کی طرف مڑ گیا۔

☆

اس بار وہ سب سے الگ الگ ایک دوسرے کی نگرانی کر رہے تھے اور ایک کو دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ انھیں ایکسٹو سے ہدایات ہی اس قسم کی ملی تھیں۔

صفدر، جوزف اور ساجدہ حبیب کی نگرانی کیپٹن خاور اور سارجنٹ نعمانی کے ذمے تھی لیکن صفدر وغیرہ کو اس کا علم نہیں تھا۔ وہ دونوں بھی ہوٹل رومانو ہی میں مقیم تھے۔ ایرانی تاجروں کے روپ میں۔ میک اپ ایسا تھا کہ پہچان لیے جانے کا خدشہ نہیں تھا۔ صفدر وغیرہ نے متعدد بار انھیں دیکھا ہوگا لیکن پہچان نہیں سکے تھے۔

اس وقت نعمانی اور خاور اس ٹیلی فون آپریٹر کی نگرانی کر رہے تھے جس نے صفدر سے مل بیٹھنا چاہا تھا۔

وہ ڈیوٹی پر نہیں تھی۔ سرِ شام ایک آدمی اُسے ہوٹل سے باہر لے گیا تھا۔ یہ دونوں اُن کا تعاقب کرتے ہوئے ہوٹل شہوار میں آئے تھے۔

ریٹا اور وہ آدمی ایک ایسی میز کے گرد بیٹھے تھے جہاں ایک معمر اور باوقار آدمی پہلے سے موجود تھا۔ اس نے کرسی سے اٹھ کر ان کا استقبال نہیں کیا تھا بلکہ ایسے انداز میں بیٹھا رہا تھا جیسے وہ خود ہی ان سے اپنا احترام کرانے کا عادی ہو۔

خاور اور نعمانی اُن کے قریب ہی ایک خالی میز کے گرد جا بیٹھے۔ دونوں میزوں کا درمیانی فاصلہ اتنا ہی تھا کہ وہ اُن کی گفتگو آسانی سے سن سکتے۔

"رپورٹ!" معمر آدمی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ نیگرو ہمارے درمیان حائل ہو رہا ہے۔" ریٹا بولی۔

"تم نے اس آدمی کا نام معلوم کیا یا نہیں؟" معمر آدمی نے پوچھا۔

"جی ہاں! اس کا نام صفدر سعید ہے اور اس کی سیکرٹری کا نام نغمانہ ہے۔"

"اور وہ نیگرو جوزف ہے! کیوں؟"

"جی ہاں! اور اسے جوزف ہی کے نام سے پکارتا ہے۔"

"یہاں تک تو درست ہے لیکن اس کے مالک کا نام صفدر سعید کی بجائے علی عمران ہونا چاہیے! مجھے یہی اطلاع ملی ہے۔" معمر آدمی خاموش ہو کر سگار سلگانے لگا۔

"لیکن صفدر کہہ رہا تھا کہ اُن کے مالک کا نام تو علی ہے۔"

"ہوں!" معمر آدمی سگار دانتوں میں دبائے ہوئے کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور اس میں سے دو تصویریں نکال کر ریٹا کے سامنے ڈال دیں۔ وہ انھیں غور سے دیکھتی رہی پھر بولی: "نہیں ان دونوں میں سے تو کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں دکھائی دیا۔"

معمر آدمی نے ایک تصویر پر انگلی رکھ کر کہا: "یہ علی عمران ہے۔"

پھر دوسری کی طرف اشارہ کر کے بولا: "یہ ساجدہ حبیب ہے جس نے ہمارے مفاد کے خلاف کچھ کام کیے ہیں اور اب عمران کے ساتھ ہے۔"

"میں دیکھوں گی۔ ابھی تک تو یہ دونوں نہیں دکھائی دیے۔"

"لیکن یہ جوزف جس کی تصویر تم پہلے ہی شناخت کر چکی ہو، عمران ہی کا آدمی ہے۔"

"آپ یہ دونوں تصویریں میرے پاس رہنے دیجیے۔ میں دیکھ لوں گی۔"

"رکھ لو۔ دوسری بات اہم یہ ہے نائن! میں نے جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کی مخالفت تم ہمیشہ سے کرتی رہی ہو۔"

"اُسے ختم کرو۔" معمر آدمی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ زندہ نہیں بچے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ پولیس کو کسی قسم کا بیان نہ دینے پائے۔"

"کیا میں اسے بھی دیکھوں؟" ریٹا نے پوچھا۔

"نہیں! اُسے دیکھ لیا جائے گا۔ تم لڑکی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔ کیا وہ آج صبح سامی کی طرف گئی تھی؟"

"اُس سے میری معمولی سی جان پہچان ہے۔ میں ملی بھی ہوں۔ اگر میری اسکیم کے مطابق کام ہوتا تو اس کی نوبت نہ آتی۔ میں اُسے آسانی سے لے آتی لیکن ابراہیم جو غالباً اس کے بنگلے کے سامنے والی عمارت میں رہتا تھا، کام اپنے ہاتھوں سے بگاڑ بیٹھا۔"

"بس!" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اب جاؤ۔ غالباً اس لڑکی سے تمہاری اس حد تک جان پہچان ہے کہ تم اس کے گھر بھی جا سکو۔"

"نہیں بھی ہے تو میں اس کے لیے جواز پیدا کر ہی لوں گی۔"

خاور کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھ رہا تھا۔

"خانی تم قریشی کا تعاقب کرو میں اس آدمی کو دیکھوں گا۔"
خانی نے کن انکھیوں سے تحریر پڑھی اور اٹھتا ہوا خاور سے بولا۔ "اچھا دوست اب اجازت دو میں کل تم سے ملوں گا۔"

دونوں نے مصافحہ کیا اور خانی ریسٹورنٹ کے باہر نکلنے سے پہلے ہی فٹ پاتھ پر اتر گیا۔

خاور وہیں بیٹھا رہا۔ معمر آدمی اب اپنی میز پر تنہا تھا۔ یہ معمر ضرور تھا لیکن صحت قابل رشک تھی۔ کوٹ کی آستینوں کے اوپر سے بھی بازوؤں کی مچھلیوں کی اکڑن واضح نظر آتی تھی چہرے پر رعب تھا۔ بس ایسا ہی لگتا تھا جیسے سر کے بال قبل از وقت سفید ہو گئے ہوں۔ داڑھی اور مونچھوں سے بے نیاز چہرہ واضح چکنا نظر آتا تھا جیسے اس کے رکھ رکھاؤ پر وقت کا کافی حصہ صرف کیا جاتا ہو۔ آنکھوں میں بجلیاں سی کوندتی محسوس ہوتی تھیں ورنہ عموماً اس عمر کے لوگوں کی آنکھیں کسی قدر دھندلا ہی جاتی ہیں، خواہ صحت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا نیم وا آنکھوں سے خلاء میں دیکھ رہا تھا۔ دانتوں میں دبا ہوا سگار شاید بجھ چکا تھا۔

خاور نے سگریٹ سلگائی اور سوچنے لگا کہ کچھ طلب کرے یا نہیں۔ معمر آدمی اپنی میز پر تنہا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ وہاں بیٹھا ہی رہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت اٹھے جب ویٹر خود اس کی طلب کی ہوئی چیزیں میز پر لگا رہا ہو پھر وہ کیسے اس کا تعاقب کر سکے گا۔ اچانک اس کا اٹھنا کسی طرح بھی مناسب نہ ہو گا۔

دوسری طرف وہاں بیکار بیٹھنا اور کچھ دیر بعد یونہی اٹھ جانا بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا ہے۔ اس آدمی نے خود اپنی نگرانی کے لیے بھی کسی کو مقرر کر رکھا ہو پھر ایسی صورت میں خالی بیٹھنا کھیل بگاڑ دینے کے مترادف ہو گا۔

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک تدبیر سمجھ میں آ گئی۔ اس نے جلدی جلدی میز پر نظر دوڑا کر کھانے کی کچھ چیزیں منتخب کیں اور اشارے سے ویٹر کو بلا کر کہا۔ "یہ چیزیں پیک کرا دو۔ میں یہاں کچھ دیر بیٹھ کر اخبار دیکھوں گا۔"

"بہت بہتر جناب عالی!"

ویٹر چلا گیا اور خاور نے دوسری خالی میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا۔ معمر آدمی اب بھی اسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا جس پر کچھ دیر پہلے نظر آیا تھا۔

کچھ دیر بعد ویٹر پیک کیا ہوا سامان میز پر رکھ کر چلا گیا۔ خاور نے اخبار سے نظر ہٹائے بغیر اس سے کہا تھا کہ وہ بل لانے میں دیر نہ لگے۔

وہ اخبار دیکھتا رہا۔ ویٹر حسب ہدایت جلدی ہی بل لے آیا۔ دام چکانے کے بعد وہ اخبار پر اس طرح جھک پڑا جیسے کوئی بہت اہم چیز پڑھ رہا تھا اور ویٹر کی دخل اندازی گراں گزری ہو۔ معمر آدمی اب میز پر جھکا ہوا تازہ سگار سلگا رہا تھا۔ خاور کے اندازے کے مطابق شاید وہ کسی کا منتظر تھا۔

وہ اور زیادہ انہماک کے ساتھ اخبار پر جھک پڑا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ معمر آدمی ایک لنگڑے کے استقبال کے لیے اپنی کرسی سے اٹھتا ہوا نظر آیا۔ لنگڑا بیساکھیوں کی مدد سے چل رہا تھا اور بیساکھیوں کی کھٹ کھٹ ہال کی پرسکون فضا میں گونج رہی تھی۔ لباس کے رکھ رکھاؤ سے باسلیقہ اور ذی حیثیت آدمی معلوم ہوتا تھا۔

معمر آدمی نے سہارا دے کر اسے کرسی پر بٹھایا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس لنگڑے کا بے حد احترام کرتا ہو۔ ہوٹل کا عملہ بھی کچھ اس طرح چاق و چوبند نظر آنے لگا تھا جیسے کسی بہت محترم ہستی نے وہاں قدم رکھا ہو۔ جس سے بھی اس کی نظر ملتی جھک جاتا ادب سے سلام کرتا اور وہ خالی الذہنی کے سے انداز میں سر کو خفیف سی جنبش دے کر سلام کا جواب دیتا۔

لنگڑے آدمی کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ بمشکل پینتیس سال کا رہا ہو گا۔ خدوخال دلکش تھے صحت بھی اچھی تھی۔ بہرحال اسے بیساکھیوں کی مدد سے چلتے دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔

دونوں کے درمیان چند رسمی باتیں ہوئیں پھر معمر آدمی نے کہا۔ "حالات کسی طرح بھی قابو میں نہیں آ رہے۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا۔" لنگڑے نے لمبی سانس لے کر کہا۔

"اوہ! ہم جس بات کا ابھی عہد کر چکے ہیں......"

"ختم بھی کرو" لنگڑا ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"آپ کچھ کرنے کی کوشش کیجیے۔ ہمارا ایک آدمی اس وقت اسپتال میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ بچنے کی امید نہیں۔ پسلیوں کی کئی ہڈیاں ٹوٹ کر پھیپھڑوں میں گھس گئی ہیں۔"

"بھلا یہ کیسے ہوا؟" لنگڑے نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

"خدا جانے... لیکن یہ سلسلہ وہی تھا۔"

"سلسلہ وہی تھا۔" لنگڑے نے قہقہہ لگایا۔

معمر آدمی کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے آثار تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی وجہ سے اظہار خیال نہیں کر سکتا۔

لنگڑا ہنستا ہی رہا۔

"آپ کب پہنچیں گے؟" بالآخر معمر آدمی نے غالباً اس کی نہ رکنے والی ہنسی سے اکتا کر پوچھا۔

"اس آدمی کا کام تمام سمجھو جو سول اسپتال میں دم توڑ رہا ہے۔ یار کیوں مجھے الّو بنانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"مت یقین کیجیے لیکن ہم نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے اسے تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔"

"مجھے جلدی ہے۔" لنگڑے نے بہت سنجیدہ ہو کر کہا۔

"جلد ہی ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ طریق کار میں کوئی خامی ہونے کی بنا پر اتنی دیر ہوئی ہے۔"

لنگڑا کچھ نہ بولا۔ معمر آدمی نے ویٹر کو اشارے سے بلا کر کچھ کہا اور وہ مؤدبانہ انداز میں سر کو جنبش دے کر چلا گیا۔

خاور کی نظر اخبار پر جمی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ویٹر ہاتھوں پر ایک ٹرے اٹھائے ہوئے ان کی میز کے قریب آیا۔ ٹرے میں شیمپین کی بوتل، سوڈے کا سائفن اور دو گلاس تھے۔

معمر آدمی نے بوتل کی سیل توڑتے ہوئے لنگڑے سے کہا۔ "آپ کو قطعی مطمئن رہنا چاہیے۔"

"یقیناً! لیکن اگر اس سے پہلے ہی کوئی کامیاب ہو گیا تو؟"

"اس پر بھی ہماری نظر ہے۔ ہم کچے کام نہیں کرتے۔"

"اچھا اگر کوئی کامیاب ہی ہو گیا تو؟"

"تب آپ کی رقم پائی پائی کا حساب کر کے واپس کر دی جائے گی۔"

"مجھے رقم نہیں چاہیے۔" لنگڑے نے کسی قدر غصے سے کہا۔ "اور جو کچھ چاہو دے سکتا ہوں۔"

"مجھے علم ہے جناب! آپ کی مالی حیثیت کس سے پوشیدہ ہے۔ بس تھوڑا وقت اور دیجیے۔" معمر آدمی نے کہا۔ لنگڑا برا سا منہ بنائے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

معمر آدمی نے گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی انڈیلی اور یکے بعد دیگرے ان میں سوڈے کی دھار مارتا رہا۔

خاور سوچ رہا تھا۔ دیکھو ان میں سے کون کب اٹھتا ہے۔ شہر کے کسی ذی حیثیت لنگڑے کو ڈھونڈ نکالنا مشکل کام نہ تھا، لیکن اگر معمر آدمی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو دوبارہ سراغ لگانے میں یقیناً دشواری پیش آتی۔

تقریباً پونے گھنٹے تک ان کا شغل جاری رہا پھر لنگڑا اٹھ گیا تھا لیکن معمر آدمی وہیں بیٹھا رہا۔ آدھی بوتل سے کم شراب باقی تھی۔ معمر آدمی نے بوتل پر ڈھکن جما کر اسے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ خاور سمجھا تھا اب وہ اٹھے گا لیکن وہ کرسی کی پشت سے ٹک کر پھر نیا سگار سلگا رہا تھا۔ اس نے سوچا جب خود اس کا مزید بیٹھنا دوسروں کو شبہات ہی کی طرف لے جا سکتا ہے لہٰذا اٹھنا چاہیے۔ باہر کہیں رک کر اس کی آمد کا منتظر رہے گا۔

اس نے ہوٹل سے خریدی ہوئی چیزوں کی تھیلیاں سمیٹیں اور اخبار کو واپس پھینک کر اٹھ گیا۔

۲۲

رات خوشگوار تھی۔ صبیحہ نے برآمدے کے دو بلب روشن کر دیے تھے جن سے لان پر بھی روشنی پھیل گئی تھی اور خود برآمدے میں بیٹھی نئے ڈرائیور کو غور سے دیکھ رہی تھی جو سامنے والی روش پر گاڑی کی صفائی کر رہا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی۔ یہ بے حد چالاک معلوم ہوتا ہے۔ دو دیر ہی سے گاڑی میں لگے لگے رات کر دی۔ اس کے گھر والوں پر اپنی مستعدی کا سکہ جمانا چاہتا ہے لیکن یہ حقیقتاً کون ہے؟

اس کا ظاہری بیان متحیر کر دینے والا تھا۔ رات اختر نے بتایا تھا۔ اس وقت صورت بدل کر رہ گئی ہے اور جیسے ڈرائیور معلوم ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے پر وہ چھوٹی ہوئی ناک اور گھنی مونچھیں نقلی تھیں شاید۔ ماں سے جب اس نے اس کی سفارش کی تو کیا تھا تو وہ فوراً ہی اسے ملازمت دینے پر آمادہ ہو گئی تھیں اور اس نے بھی خوب ہی باتیں بنائی تھیں۔ کہنے لگا نہ جیبوں کی پرواہ ہے اور نہ کھانے کی، کم تنخواہ ہو وہ بھی سوکھی میں گزر کر لوں گا۔ بس اتنا لگا دیا جائے کہ مجھے کوئی آدمی ہی سمجھیں۔ ایسی گفتگو کی جائے مجھ سے کہ میں خود کو آدمی تصور کر سکوں۔ عزت دار گھرانے کا آدمی ہوں۔ بس برے وقت نے مجبور کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سگریٹ نہیں پیتا۔ اگر آپ حوالے چاہیں تو بہت بڑے بڑے آدمیوں کے حوالے دے سکتا ہوں جن کے ساتھ رہ چکا ہوں۔"

اور پھر اس نے سب سے پہلے جام لیگ فری مسٹر سلطان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

"ان سے پوچھ لیجیے کہ عبدالمنان کیسا ڈرائیور ہے اور کیسا آدمی ہے؟"

ماں اس حوالے پر کافی مرعوب ہوئی تھیں اور انہوں نے چاہا تھا کہ تنخواہ کا مسئلہ بھی طے کر لیں لیکن وہ یہی کہتا رہا تھا کہ جناب جو کچھ دیں گے مجھے منظور ہو گا۔ مجھے تو دو وقت کی روٹی اور رہنے کو جگہ چاہیے پھر یہ معاملہ باپ کی واپسی تک کے لیے ٹال دیا گیا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی اور اسے گھورتی رہی جو ایک تنکے کو ہونٹوں میں دبا کر گنگنا رہا تھا۔

"ارے عبدالمنان! اِدھر آؤ۔" دفعتاً صبیحہ نے اسے مخاطب کیا۔

اور وہ کسی پالتو کتے کی طرح اس کی طرف چلا آیا۔

"اب تم بھی ہو گئے یا مر گئے یا نہیں؟" اُس نے کچھ تیوری چڑھا کر کہا۔

"بی بی جی! ہم کیا کہے۔" وہ انتہائی بے بسی سے بولا۔ "پچھلے ڈرائیور نے بڑا کباڑا کر رکھا ہے۔ سالا کاربش بالکل خلاص ہو گیا ہے۔ بیٹری نہیں چڑھتا تو ہینڈل بازی کرنی پڑ گئی۔"

"ارے تو مستری بھی ہو؟"

"ہاں ہاں بی بی جی! اب یہ گاڑی کسی ورکشاپ میں نہیں جائے گی۔"

"کل سے کوئی ہو جیسی۔"

"ارے کیا، ہمارا باپ تو آنکھوں پر پٹی باندھ کر اِدھر اُدھر چل کیا کرتا تھا۔"

"ہاں ہاں ایسی ہی بات ہو گی۔" صبیحہ نے اونچی آواز میں کہا اور پھر آہستہ سے بولی۔ "میں نے سنا ہے اس کی حالت بہت خراب ہے۔"

"مرنے دو۔" اُس نے بے پروائی سے شانوں کو جنبش دی۔

"میں بہت پریشان ہوں۔ اگر اس نے پولیس کو بیان دے دیا تو؟"

"دیکھا جائے گا۔ اس نے مجھے اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ کیا وہ یہ سمجھ گیا ہو گا کہ تم میرے ہی ساتھ آئے تھے؟"

"سمجھنے دو۔"

"ارے میری بدنامی۔"

"بدنامی؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "بدنامی کی پروا ہوتی تو تم کسی اختر کا بھیجا ٹھکرا کر لیتیں۔"

"ارے اپنا لہجہ ٹھیک کرو... عبدالمنان۔"

"بہت بہتر مس صاحب۔"

"تم آخر ہو کیا بلا۔"

"ڈرائیور مس صاحب فی الحال۔"

"میں سوچتی ہوں کہیں تم ہم لوگوں کے ساتھ کوئی فراڈ نہ کرو۔"

"بس سوچتی رہیے اس وقت تک جب تک کہ میں کوئی فراڈ نہ کر بیٹھوں۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ بس سوچتی ہی رہ جائے گا۔ اُدھ... وہ دیکھیے کوئی بیگم صاحبہ آ رہی ہیں۔"

صبیحہ چونک کر پھاٹک کی طرف مڑی۔ پھاٹک پر کوئی سفید فام عورت تھی۔ سفید بلاؤز اور نارنجی اسکرٹ میں ملبوس تھی۔

وہ برآمدے کی طرف بڑھتی رہی۔ کچھ اور قریب آئی تو صبیحہ نے اُسے پہچان لیا۔ اکثر ریڈ کراس کے رفاہی پروگراموں کے سلسلے میں پہلے بھی اُس سے ملاقات ہو چکی تھی۔ ریٹا جبرائیل نام تھا۔ ریڈ کراس کی تنظیم کی عہدیداروں میں سے تھی اور اس کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے میں اکثر لوگوں کو مدد دیتی تھی۔

صبیحہ نے اُس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے آثار دیکھے۔

"ہیلو صبیحہ! ایم ہو۔" وہ قریب پہنچ کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہوئی چہکی۔ "کیا معلوم تھا کہ اس طرح ملاقات ہو گی؟"

"آؤ... آؤ بیٹھو۔"

"ضرور بیٹھوں گی۔ بہت تھک گئی ہوں۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "وہ جب سے ان اطراف کے چکر لگا رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"ارے وہی مسز آرتھر کا چکر ہے۔ ریڈ کراس والا فنڈ جمع کرنے نکلے ہیں۔"

"کافی پیو گی یا چائے؟"

"کچھ بھی نہیں! تم تو یہ بتاؤ کہ کتنا دے رہی ہو؟"

"کافی پیو، وہ پھر سوچیں گے۔" صبیحہ نے کہا اور ڈرائیور کو مخاطب کر کے کہا۔ "کافی کے لیے کہہ دو۔"

"جی اچھا!" ڈرائیور نے سر ہلا کر کہا اور چلا گیا۔

"کہو کیسی گزر رہی ہے؟" ریٹا نے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں! یہاں بوریت کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے؟"

"کیوں؟ کیا اب ڈرائیونگ نہیں کرتیں۔ شاید ایک بار تم نے بتایا تھا کہ اکثر صبح ہی صبح دور تک تنہا نکل جاتی ہو۔"

"وہ... تو... ہاں... ہے... بہت دنوں سے ایسا کوئی اتفاق نہیں ہوا۔" صبیحہ نے کسی قدر پریشانی کے ساتھ کہا کیونکہ اچانک آج کا واقعہ پھر یاد آ گیا تھا۔

"ضرور جایا کرو۔ اس قسم کی تبدیلیاں صحت کے لیے مفید ہیں۔"

"اب تو وقت ہی نہیں ملتا۔"

"ہو تو میں بھی ساتھ چلا کروں۔"

"مشکل ہے۔ پاپا نے پابندی لگا دی ہے۔ پھر اب ڈرائیور کو کون ساتھ گھمانے پھرے؟"

"مجھے اپنے پاپا سے ملاؤ۔ شاید میں ان سے کچھ زیادہ رعایت حاصل کر سکوں۔"

"وہ تو پہلے چلے دورے پر گئے تھے ابھی تک واپس نہیں آئے۔"

"اوہ۔ تب تو آزادی ہے۔ چلو کل صبح چلیں۔"

"اور ممی تو ہیں۔"

"وہ کیا کریں گی؟"

"پاپا سے کہیں گی زیادہ خونخوار ہیں۔"

"اُن سے علاوہ۔"

"اس وقت تو مشکل ہے۔ وہ عبادت کر رہی ہوں گی۔"

"بہت مذہبی ہوں والدین سے۔"

"ڈرنا ہی چاہیے۔ والدین کا خوف ہمارے سکھ کا ضامن ہے۔"

"ہونہہ تم آج ہی گاڑی لے کر حسب عادت ویرانے کی طرف نکل گئی ہو گی۔ کچھ تو میدان صاف تھا۔"

"ہم لوگ والدین کو دھوکا دینا برا سمجھتے ہیں۔"

"اچھا نہیں گئی تھیں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"میں یقین نہیں کر سکتی۔"

قبل اس کے کہ صبیحہ کچھ کہتی ڈرائیور کی آواز سن کر چونک پڑی جو کہہ رہا تھا۔ "باورچی پاگل ہو گیا ہے... کہہ رہا ہے ہرگز نہ بناؤں گا کافی پینا ہو تو جاتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی اسی سے پوچھیے گا میں کیا جانوں۔"

"ٹھہرو! میں دیکھتی ہوں۔" صبیحہ نے کہا اور ریٹا سے انگریزی میں بولی۔ "ٹھہرو میں ابھی آئی۔"

وہ تیزی سے صدر دروازے سے گزر گئی پھر کچن کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ڈرائیور کی آواز سن کر رک جانا پڑا۔

"خواہ مخواہ باورچی پر نہ الٹ پڑیے گا۔ میں آپ کو محض وہاں سے ہٹا کر ایک بات کہنا چاہتا تھا۔"

"تم آدمی ہو یا گھن چکر۔" صبیحہ کو تاؤ آ گیا۔

"سن تو لیجیے بات ورنہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں گی۔ وہ شیطان کی خالہ صرف یہ معلوم کرنے آئی ہے کہ تم نے آج صبح ڈرائیونگ کی تھی یا نہیں۔"

"تم کیا جانو، ہم انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔"

"فرانسیسی اور جرمن میں باتیں بھی کر کے دیکھ لو... اگر کچھ لوں تو مجھے الھڑ لینا کیا سمجھتی ہو بلی۔"

"وہ کیوں انکوائری کرنا چاہتی ہیں؟"

"یہ تو مجھ سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ اسے کب سے جانتی ہو؟"

"عرصے سے جانتی ہوں لیکن وہ میرے گھر پہلی بار آئی ہے۔"

"آج ہی شناسائی اور وہ واقعہ پیش آ گیا۔"

"تو کیا... تو کیا... اس کا تعلق خفیہ پولیس سے بھی ہو سکتا ہے؟"

"میں تو یہی سمجھتا ہوں۔"

"پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ہرگز اعتراف نہ کرنا کہ تم آج صبح گاڑی لے کر گئی تھیں۔"

"اور... اور... کافی؟"

"تیار ہو رہی ہے۔ بس اب جاؤ... باورچی کو کسی فرشتے کی اولاد معلوم ہوتا ہے۔"

"تم عقل پر پتلنے کے لیے مجھے اُدھر لائے تھے؟"

"بالکل... بالکل... اب جاؤ... میں کچھ دیر تمھاری نانی اماں کو کسی اٹھارہ سو ستاون کے غدر پر تفصیلی سناؤں گا۔"

صبیحہ سوچ میں ڈوبی ہوئی پھر برآمدے میں واپس آ گئی جہاں ریٹا اس کی منتظر تھی۔

"کتنے کی رسید کاٹوں؟" ریٹا نے وینٹی بیگ سے رسید بک نکالتے ہوئے پوچھا۔

"پیسے لینے نہیں گئی تھی۔ میرا باورچی انتہائی نالائق اور کام چور ہے۔ اُس نے کافی تیار کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ رات کو کافی پینے سے طبیعت بگڑ جاتی ہے۔"

"کیا اُس گندی مونچھوں والے نے بھی اطلاع دی تھی؟"

"ہاں!"

"وہ بھی تمھارا کوئی ملازم ہے؟"

"ہاں! ڈرائیور ہے۔"

"میں تو ایسی گندی مونچھ والے کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہ کر سکوں۔"

"پسند اپنی اپنی! مجھے کسی کی مونچھیں ہی تو اچھی لگتی ہیں۔"

"شش... خیر... کتنا دے رہی ہو؟"

"دس روپے لکھ لو... پاپا کی واپسی سے پہلے میری ذاتی مالی حالت بہتر نہیں ہو سکے گی۔"

"اچھی بات ہے۔" ریٹا نے کہا اور رسید بک پر کچھ لکھنے لگی۔ پھر رسید پھاڑ کر اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ "میرا خیال ہے کل صبح کی سیر میں تمھیں میرا اور تمھارا ساتھ ضرور ہو گا۔"

صبیحہ کچھ نہ بولی۔ اب تو یقین آ گیا تھا اُسے سوچنا پڑا تھا آخر وہ صبح کی سیر کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔

"اچھا تو پھر...؟" ریٹا اٹھتی ہوئی بولی۔

"بیٹھو... بیٹھو... کافی پلائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔"

"بہت کام کرنا ہے صبیحہ۔"

"فکر نہ کرو! کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

وہ پھر کچھ کہنے والی تھی کہ ایک ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آ گیا۔ صبیحہ نے ریٹا کے لیے کافی انڈیلی لیکن اس کی الجھن بڑھتی جا

جا رہی تھی۔ وہ دونوں آنکھیں سے ریشما کی طرف دیکھتی رہی کافی چپکیں
پتی رہی۔ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ کسی خفیہ پولیس سے تعلق
رکھتی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو آج ہی یہاں کیوں آئی تھی۔ پہلے
یہاں نہیں آئی تھی۔ خود بہ خود ہی معاملہ صدیقہ کو اس کے
بیٹے تک اغوا کیا گیا تھا۔

خدا خدا کر کے کلاس ختم ہوئی اور ریشما رخصت ہو گئی لیکن صبیحہ
وہیں بیٹھی رہی۔ اس کے پیچھے سب سے پیچھے بیٹھی تھی اس لیے ابھی بچے نہ
دیکھ سکیں۔

نیلوفر ابھی کلاس کی کھڑکی ہی میں تھی کہ اسے ظہور دیر سے ادھر سے
گزرا۔ صبیحہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

وہ قریب آ گیا۔

"تم بہت پریشان ہو مس خرم؟" صبیحہ رومال سے چہرے
کا پسینہ خشک کرتے ہوئے بولی۔

"مجھ سے زیادہ دیر ہو گئی؟"

"اور تو اب تمہیں پریشانی ہے؟"

"ہاں بھی۔۔۔ تمہیں پتا ہے مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے بھی
یہ تو ساری حرکتیں کوئی کر رہی ہیں۔ سہیلیوں کو اب ضرور
گروانی چاہیے؟"

"نہیں اس کی پرواہ نہیں ہے۔" صبیحہ حیرت سے بولی۔

"اور کیا۔ اب تم دونوں نے سوچا تو شک سے بھی دیکھیں گے؟"

"مجھے اس کی فکر نہیں۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ جو بچہ تھا نہیں ابھی تک
بھی ہو چکا ہے یا؟"

"نہیں؟" ذرا غور سے غصیلے لہجے میں کہا۔

"وہ لڑکی جو ایک خفیہ پولیس میں ہی کی معلوم ہوتی ہے۔
پہلے مجھ سے تمہارے بارے میں کوشش کر رہی تھی کہ آج تم میں سے
کسی کی طرف کی بھی یا نہیں؟"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے تو یہ بات کہی کہ ہم صرف ملاقات کر لیتی ہیں۔"

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"لیکن تم تو میں سمجھی تھی کہ تم نے دیکھا ہو گا؟"

"پرواہ مت کرو۔ شک کی سی چیز تمہارے خلاف ثبوت کے
طور پر نہیں پیش کی جا سکتی۔ بس اپنی زبان بند رکھو۔"

"ہیں! اچھا پھر تم یہ سارا سامان کشتی میں سے لائے یا نہیں؟"

"سوچ لیں کہاں ملا ہو تو اب چلا جاؤں؟"

"ضرور جاؤ۔ ورنہ پھر کچھ ہی پر سونا پڑے گا تمہیں۔
بستر کا انتظام نہیں کیا جا سکتا؟"

خاور سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ رینگ نہیں کا منتظر ہے
کے بعد اس نے محسوس کیا تھا اب شاید جلدی ہی نیند آ جائے۔
پھر وہ بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اٹھ
کر دروازہ کھولا تو آنے والا شفیق ہی تھا۔

اس کی آنکھوں سے تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ آتے ہی چوڑی
کھاٹ بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

"کیا ہوا؟" خاور نے پوچھا۔

"یار تھکا دینے والا کام تھا نے۔ ہیڈ مل کر بیٹھ کر اس کے
بیچ تھا شمال سے شروع کر دیا تھا لہٰذا اس کو اتنا ہی بتا سکا
کہ اس کی منزل مقصود کہاں تھی۔ تقریباً دو گھنٹے تک چکر لگا کر
کوٹھیوں میں گھسی تھی۔ لہٰذا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ وہ کس لڑکی کا
قصہ تھا۔ البتہ ایک بات ہے۔"

"کیا؟ ذرا جلدی سے کہانی ختم کرو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"ایک بنگلے میں مجھے تھوڑی دیر بھی نظر آیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا
ایک ایسے ہی تھا جس میں لڑکیاں ہوتی ہیں اور جو بالکل پاگل والی۔"

"تب پھر یقین کر لو کہ وہ بنگلہ منزل مقصود تھی۔ کون رہتا
ہے وہاں؟"

"حاجی صدیق کی ذہنی تشخیص۔"

"ہوں۔"

"تم نے کیا کیا؟" خاور نے پوچھا۔

"وہ ظاہر آدمی وہاں کا ایک کامیاب ترین بزنس مین ہے جس
سے زیادہ کسی کا میں تعلق نہیں ہے۔ جیسے کیا اس کا نام ہے اور
ایک لنگڑا آدمی ہے۔ اس کا تعاقب نہیں کر سکا تھا مجھے کیا نہیں
ملا اس سے زیادہ اہم معلوم ہو سکتا ہے۔"

"آخر عمران وہاں کیا کر رہا ہے۔ اب اس کا بھی تعاقب کرتے
رہو تو ہو سکتا ہے وہ کسی کا بھی پیچھا کر دے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہمارے معاملات میں پہلے ہی سے اس کی ٹانگ اڑی ہوئی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم اسی کے تحت کام کر رہے ہیں؟"

"یار اب تو مجھے بھی شبہ ہے۔"

"کیوں؟"

"وہ صرف ایک ایجنٹ ہے۔ آخر ایکس ٹو ہم میں سے کسی کو
اپنا راز کیوں نہیں بتاتا؟"

"ختم کرو۔" قادر جماہی لے کر بولا۔

"نہیں میں بڑی شدت سے بور ہوتا ہوں اکثر اس سلسلے پر۔" نعمانی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

★

ساجدہ حبیب کو جوزف کی حرکتوں پر غصہ نہیں آتا تھا البتہ صفدر پر ہنسی آتی تھی جب وہ جوزف پر دانت پیستا تھا۔

جوزف کا معمول تھا کہ جب تک صفدر کمرے میں رہتا وہ باہر پہرے کے سپاہی کی طرح "اٹینشن" کھڑا نظر آتا اور اس کی عدم موجودگی میں ساجدہ حبیب کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا۔

اس وقت بھی صفدر کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ ساجدہ تنہا تھی، اور جوزف اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا۔

ساجدہ سویٹر بُن رہی تھی۔ جوزف کبھی کبھی اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھنے لگتا۔ ایک بار ساجدہ نے بھی اسے اپنے ہاتھوں کی طرف گھورتے دیکھ لیا اور ہنس کر بولی "کوئی بد رنگ تو نہیں ہے؟ مثلاً میرے ان ہاتھوں پر؟"

"میں یہ نہیں دیکھ رہا۔" جوزف بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"پھر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں مسی! اپنا کام کرو۔"

"تم آخر اتنے چڑچڑے اور کھٹکے کیوں ہو؟"

"میرے مقصد کی خوش مزاجی بھی باس ہی کو مل گئی ہے۔"

"اچھا مجھ سے اپنے باس کے بارے میں باتیں کرو۔" ساجدہ نے اون کا گولا اور سلائیاں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا باتیں کروں؟"

"تم اس کے سامنے کیوں بھیگی بلی بنے رہتے ہو؟"

"اکثر انتہائی خوش مزاج آدمیوں کو بھی غصہ آجاتا ہے۔"

"تم اس سے ڈرتے ہو؟" ساجدہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ڈرنے ہی کی چیز ہے مسی۔"

"ارے جاؤ۔" ساجدہ ہنس پڑی۔

"یقین کرو مسی اُسے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔"

"اور جاننے والوں میں سے ایک تم بھی ہو؟"

"ہاں میں جانتا ہوں اُنھیں۔"

"اچھا جاؤ اُس کی نظروں میں کسی کی اہمیت بھی ہے یا نہیں؟"

"اُن کی نظر میں خود اُن کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔"

"وہ خود کو احمق کیوں پوز کرتا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔" جوزف نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"پھر کیا جانتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، بس خاموش رہو یا کوئی اور بات کرو۔"

دفعتاً دروازے پر کسی نے دستک دی۔ جوزف نے اٹھ کر دروازے کے قریب سے غرّاتی ہوئی آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"ہوٹل منیجر ہوں جناب!" باہر سے آواز آئی۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے بھیجا گیا ہے جناب!"

"کس نے بلایا ہے؟"

"اسی کمرے سے کسی نے فون کیا تھا۔"

"بھاگ جاؤ کسی نے نہیں بلایا۔"

"بہت بہتر جناب!"

اور پھر جوزف قدموں کی دور ہوتی ہوئی چاپ کی طرف کان لگائے رہا۔

"یہاں سے تو کسی نے بھی فون نہیں کیا تھا۔" ساجدہ بولی۔

"مجھے باس ہی سے پوچھنا چاہیے۔" جوزف سر ہلا کر بولا۔

"کیوں کیا تم کسی قسم کا خطرہ محسوس کر رہے ہو؟"

"ہم یہاں تفریح کرنے تو نہیں آئے مسی! باس نے کسی مقصد ہی کے تحت بھیجا ہے۔ میں نہیں جانتا تمہاری کہانی کیا ہے؟"

"تم... میری کوئی کہانی نہیں ہے۔"

"ہو بھی تو مجھے کیا؟" جوزف نے بے پروائی سے شانوں کو جنبش دی۔

دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا لیکن قبل اس کے کہ معاملے کی نوعیت سمجھ میں آتی سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ دو وزنی موگریاں یکے بعد دیگرے اتنی تیزی سے سر پر پڑی تھیں کہ وہ ایک کی بھی چوٹ نہ بچا سکا۔

حملہ آور دروازے کی دونوں جانب دیوار سے چپکے کھڑے تھے۔ جوزف کسی قسم کی آواز نکالے بغیر بے حس و حرکت ہو گیا۔

دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے تھے اور ساجدہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کھڑی تھی۔ حملہ آوروں میں سے ایک نے اس سے کہا "میرا داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ہے۔ انگلی بے آواز ریوالور کے ٹریگر پر ہے۔ باہر نکلو اور بائیں جانب چلتی رہو۔"

"لل... لیکن!"

"خاموش... چلو۔"

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آئی۔ جوزف بے حس و حرکت پڑا نظر آیا۔

"بائیں طرف چلو... پھر کہا گیا۔

پوری راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہ جلد ہی تیسری منزل کے زینے طے کر رہے تھے۔ اگر کوئی راہ میں مل بھی جاتا تو اُسے ذرہ برابر بھی کسی قسم کا شبہ نہ ہوتا کیونکہ ساجدہ ان دونوں سے کافی فاصلے پر چلتی رہی تھی۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب رہا تھا کہ وہ بالآخر پہچان لی گئی۔

تیسری منزل پر پہنچ کر دھمکی دینے والا اُس سے کسی قدر قریب ہوتا ہوا بولا۔

"کمرہ نمبر اٹھاون میں چلو۔"

وہ کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گئی۔ اُس کے پیچھے دونوں بھی کمرے میں داخل ہوئے اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

اب دھمکی دینے والے کی جیب سے ریوالور بھی نکل آیا تھا۔ اُس نے اس کا رخ ساجدہ کی طرف کیا ہی تھا کہ دوسرا بول اٹھا۔

"ٹھہرو! فائر نہ کرنا۔"

"کیوں؟" پہلا غرّایا۔

"پہچانتے نہیں یہ ساجدہ حبیب ہے بھی یا نہیں؟"

"وہی ہے۔ تصویر نکالو اور آنکھوں کی بناوٹ ملاؤ۔ عقل ناک اور دہانے کے پلاسٹک میک اپ سے کیا ہوتا ہے۔ پیشانی کی بناوٹ دیکھو۔"

"مجھے بھی کبھی اس طرح مار ڈالنے سے کیا فائدہ؟"

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ زندہ رکھ کر کیا کریں گے؟"

"احمق! کوئی اس کے علاوہ اور کون عمران کا پتہ بتا سکے گا۔"

"اوہ ٹھیک ہے لیکن کیا تمہیں اس حکم کا علم نہیں ہے کہ اگر نہ بتائے تو فوراً گولی مار دی جائے۔"

"مجھے علم ہے اور تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ بتا دینے کی صورت میں اگر یہ اپنی بے گناہی بھی ثابت کر سکی تو زندہ رہے گی۔"

"مجھے سب معلوم ہے تم خاموش رہو۔" ریوالور والے نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور ساجدہ سے پوچھا "بتاؤ عمران کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتی یقین کرو۔"

"یہاں آنے کا مقصد ہی بتا دو۔"

"میرے خیال میں وہ اس طرح انجمن کے سربراہ لوگوں کا پتہ لگانا چاہتا ہے۔"

"بھلا کس طرح؟"

"اس طرح کہ میں اس میک اپ میں پہچان لی جاؤں گی اور انجمن والے مجھے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے لیے انہیں یہاں سامنے آنا پڑے گا۔"

"تو اس نے تمہیں قربانی کا بکرا بنایا ہے؟"

"اب اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں جب کہ اتنی آسانی سے پہچان لی گئی۔ مجھے مل جائے تو خود ہی اس کی بوٹیاں چبا ڈالوں۔"

"آخر بنا رہی ہو ہمیں۔"

"یقین کرو میں نے زبردست دھوکا کھایا ہے۔ دراصل اُسے انجمن ہی کا کوئی فرد سمجھ بیٹھی تھی۔ پروفیسر کے قتل کے بعد میں ضروری کاغذات نکال لانے کی فکر میں تھی جہاں پہنچی تھی وہیں وہ بھی موجود تھا۔ اس طرح کی باتیں کیں اس نے کہ میں نے علویہ آباد شاخ کا صدر سمجھ بیٹھی پھر اس نے ہیرو اور مقامی سیکریٹری کے درمیان اس قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی کہ میں انجمن کی طرف سے بھی بُری بن گئی پھر بتاؤ میں اپنی جان بچانے کے لیے کیا کرتی؟"

"اس کے باوجود بھی تم نے کاغذات تک اس کی رسائی ہونے دی؟"

"پھر میں کیا کرتی۔ انجمن کی نظر میں تو میں غداری کی مرتکب ہو ہی چکی تھی حالانکہ ایسا نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔"

"تو پھر اپنی وفاداری کا ثبوت دو۔"

"کیسے دوں؟ میں کہہ رہی ہوں کہ میں نہیں جانتی۔ نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے صفدر اور جوزف کے ساتھ یہاں بھیج کر وہ جانے کہاں چلا۔"

"یہ تو بتا ہی دو کہ آخر تمہیں کیا کرنا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں... قطعی نہیں۔"

"پھر سوچ لو ہم تمہیں گولی مار سکتے ہیں۔"

"جو تمہارا دل چاہے کرو۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ تم کیا ہو تمہاری حقیقت کیا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"میں ایک تانگے والے کی بیٹی ہوں۔ گھوڑے نہیں تھے تو آدمیوں کو ہانک کر کھاتی ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ غرّایا۔

ساجدہ ہنس پڑی۔ اب وہ انھیں مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُن دونوں کی آپس کی گفتگو سے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ ذہین لوگ نہیں ہیں۔ انھیں با آسانی الّو بنایا جا سکے گا۔ یہ احمق اُسے بچوں کی طرح ٹریٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ انھیں جھکّا دینے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔

"تم ایسی ہی معلوم ہوتی ہو۔" دوسرے نے دانت پر دانت جما کر کہا "ذرا اپنی اصلی شکل تو دکھاؤ۔"

"میں نہیں جانتی کہ یہ میک اپ کیسے ختم ہوگا؟" اس نے جھنجلا

کرکہا۔

"فکر نہ کرو اس کا انتظام پہلے ہی کرچکے ہیں ہم لوگ۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کا اندازہ تھا کہ ان دونوں میں سے ایک عملی طور پر رام کیا جاسکتا ہے۔

پہلا آدمی الماری کھول کر کچھ تلاش کرنے لگا اور دوسرا ساجدہ کو گھورتا رہا۔ اس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہی رام کیا جاسکتا ہے۔

"انجمن نے مجھے غدار قرار دے کر اپنا ہی نقصان کیا ہے۔" ساجدہ آہستہ سے بولی لیکن آواز اتنی دھیمی بھی نہیں تھی کہ پہلا نہ سن سکتا۔ وہ بھی مڑ کر ساجدہ کو گھورنے لگا تھا۔

"خاموش کیوں ہوگئیں، بولتی رہو تمہاری آواز کانوں کو بھلی لگتی ہے۔" اس نے کہا۔

"میں غداری کی مرتکب نہیں ہوئی ہوں۔ انجمن ہی کے ارکان نے مجھے ان لوگوں کے پنجے میں پھنسایا ہے۔ میں عمران سے واقف نہیں تھی صرف اس کا نام پروفیسر کی زبانی سنا تھا۔ عمران نے خود کو عادل لنگڑا شاہ کا مصدر ظاہر کرکے مجھے دھوکا دیا۔ میں اسے مقامی سیکریٹری کے پاس لے گئی۔ اس نے عمران کو پہچان لیا۔ میں اسے کسی طرح بھی یقین نہ دلاسکی کہ عمران کو اس حیثیت سے نہیں جانتی جو انجمن کے مفاد کے خلاف تھی پھر وہاں جھگڑا ہوا اور میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ عمران ہی کے ساتھ چلی جاؤں۔ میں اب بھی انجمن کی وفادار ہوں۔ یہاں ان لوگوں میں رہ کر بھی انجمن کی خدمت کرسکتی ہوں۔"

ساجدہ خاموش ہوکر ان کے چہروں پر اپنی گفتگو کا رد عمل تلاش کرنے لگی۔ وہ دونوں ہی کسی گہری سوچ میں معلوم ہوتے تھے۔

کچھ دیر بعد پہلے نے کھنکار کر کہا۔ "ہوں... اوں، بات تو ٹھیک ہے لیکن ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے۔"

"کیوں؟"

"ہم سے صرف اتنا ہی کہا گیا تھا کہ تمہیں قابو میں کرکے عمران کا پتا معلوم کریں۔"

"تمہیں بتادیتی لیکن فی الحال مجھے خود علم نہیں ہے۔"

"ہمیں تمہارے متعلق دوسرے احکامات حاصل کرنے پڑیں گے۔"

"کچھ بھی کرو ذرا جلدی کرو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ان دونوں [illegible] کی نیند سوسکوں گی۔"

دونوں پر تفکر انداز میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔ ساجدہ باری باری سے انہیں گھورے جارہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تیر شاید نشانے پر بیٹھا ہے لہٰذا چپ ہولی۔

"میں خود ہی اس فکر میں ہوں کہ کسی طرح مجھے اس مردود کا پتا نشان معلوم ہوجائے میری تنتی پلید کرکے رکھ دی اس نے۔ لیکن وہ بھی کیا یاد کرے گا۔"

"کیا یاد کرے گا؟" پہلے نے پوچھا۔

"اگر یہ میری زندگی کا آخری دن نہیں ہے تو تم خود ہی دیکھ لینا۔"

"ختم کرو یہ قصہ۔" دوسرے نے پہلے سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ لڑکی جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"دوسرے احکامات تک ہمیں اسے یہیں روکنا چاہیے۔"

"اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ ہمیں دھوکا نہیں دے گی؟"

"کیوں؟" دوسرے نے ساجدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں اب ان لوگوں میں واپس نہیں جانا چاہتی۔"

وہ دونوں کچھ نہ بولے۔ ان کے چہروں پر ایسے آثار تھے جیسے جلد سے جلد کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہوں لیکن عقل رہنمائی نہ کررہی ہو۔

☆

نعمانی نے جوزف کو فرش پر بے ہوش پڑے دیکھا تھا لیکن وہ اس کے علاوہ اور کیا کرسکتا تھا کہ ہوٹل کے کارندوں کو اس کی اطلاع پہنچا کر خود قطعی بے تعلق ہوجاتا۔

اس کے بعد اسے تیسری منزل کے کمرہ نمبر اٹھاون کی نگرانی شروع کردینی پڑی تھی۔

وہ دونوں ساجدہ کو اندر لے گئے تھے اور پھر کچھ دیر بعد وہ باہر بھی نکل آئے تھے۔ کمرہ مقفل کیا تھا اور کہیں چلے گئے تھے اور وہ اب یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا کہ ساجدہ پر کیا گزری۔ اس طرح کمرہ بند کرکے چلے جانے کا مطلب تو یہی تھا کہ یا تو انہوں نے اسے بے بس کردیا ہے یا پھر قتل!

ایکسٹو کی طرف سے کسی معاملے میں دخل اندازی کی اجازت نہیں ملی تھی۔ صرف نگرانی کرنے اور رپورٹ دینے کے لیے کہا گیا تھا۔

زرد رنگ کے کاغذ پر کوڈ ورڈز میں رپورٹ لکھی جاتی تھی اور پھر وہ کاغذ تہ در تہ موڑ کر ہوٹل کے ایک مخصوص ڈسٹ بن میں ڈال دیا جاتا۔ اس کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس ڈسٹ بن کی نگرانی بھی کرسکے۔ یہ دیکھنے کہ اس کی مرتب کردہ رپورٹ ایکسٹو تک پہنچتی ہے۔

اس نے خاور کو راہداری کے سرے پر رکنے کا اشارہ کیا اور خود کمرہ نمبر اٹھاون کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

ادھر ادھر دیکھ کر قفل کے سوراخ سے آنکھ لگادی۔ سامنے ہی ساجدہ نظر آئی لیکن اس حال میں کہ ہاتھ پیر کرسی کے پایوں اور ہتھوں سے جکڑ دیے گئے تھے اور منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کبھی آنکھیں کھل جاتیں اور کبھی وہ انہیں طویل وقفے کے لیے بند کرلیتی۔

نعمانی نے قفل کے سوراخ سے آنکھ ہٹائی اور زینوں کی طرف بڑھا۔

"کیا بات ہے؟" خاور نے بھی زینوں کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

"زندہ ہے لیکن ہاتھ پیر کرسی سے باندھ دیے گئے ہیں اور منہ پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔"

"اب تو زبردست غلطی ہوئی ہے۔ غالباً وہ اس کے لیے کسی سے احکامات لینے گئے ہیں۔ ان کا تعاقب کیا جانا ضروری تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ کسی دوسری بات کا انتظام کرنے گئے ہوں۔" نعمانی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے کیسے کہہ دیا کہ کسی سے احکامات لینے گئے ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ زیادہ جانتے ہو۔ مجھے تو اس سب کے مقصد کا علم نہیں۔"

"عقل کو تھوڑی سی جنبش دینے پر سب کچھ سمجھا جاسکتا ہے۔ ہمیں صرف ان کی نگرانی کرنے کو کہا گیا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ساجدہ میک اپ میں ہے لیکن مسعود اور جوزف کے لیے ایسی کوئی قرار نہیں دیا گیا۔ ہم دونوں بھی میک اپ ہی میں ہیں۔ ساجدہ کا میک اپ میری دانست میں مکمل نہیں ہے۔ وہ اپنی پیشانی اور آنکھوں کی بناوٹ سے صاف پہچانی جاسکتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ایکسٹو نے کسی بڑی مچھلی کے لیے یہ چارہ لگایا ہے۔"

نعمانی کچھ نہ بولا۔ وہ زینے طے کرکے نچلی منزل کی طرف جارہے تھے۔ دوسری منزل پر پہنچ کر اس نے پوچھا۔ "جوزف کو کہاں لے گئے تھے؟"

"غالباً اسپتال میں۔ سر پھٹ گیا ہے۔"

"ہوش میں آگیا تھا؟"

"کسی قدر... اور وہ بڑبڑا رہا تھا کہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نشہ اکھڑ گیا ہے۔ تھوڑی سی پی لینے دو پھر کہیں لے چلو۔"

"پتا نہیں کیا چکر ہے۔ ادھر وہ اس قسم کی حرکتیں کرتا رہا ہے کہ ہوٹل میں اس کی خاصی شہرت ہوگئی ہے۔"

اپنے سراپے پر
ایک نظر ڈالیں
ہوسکتا ہے کہ

☐ آپ چھوٹے قد کی وجہ سے ہردم بجھے بجھے اور شرمسار رہتے ہوں اور چاہتے ہوں کہ تین انچ تک قد بڑھانا چاہتے ہوں۔
☐ چہرے کے کیل چھائیوں، داغ دھبوں اور جھائیوں نے آپ کی زندگی اجیرن کردی ہو۔
☐ آپ کے سر کے بال تیزی سے گر رہے ہوں، سفیدی مائل ہوں یا خشکی اور سکری کی لپیٹ میں آچکے ہوں۔
☐ آپ سگریٹ نوشی کے ہاتھوں تنگ ہوں اور اس عادت کو ترک کرنا چاہتے ہوں۔
☐ بچپن اور جوانی کی بدعادات کے سبب آپ اپنے آپ کو ناکارہ محسوس کرتے ہوں اور پرسکون ازدواجی زندگی گزارنے کے متمنی ہوں۔
☐ آپ کا چہرہ، جسم یا کوئی ایک عضو موٹاپے کی طرف مائل ہو اور آپ اس سے جان چھڑانا چاہتے ہوں۔
☐ کمزور یادداشت اور حافظہ آپ کی تعلیم، کاروبار اور مستقبل پر اثرانداز ہورہا ہو۔
☐ نسوانی حسن یا کوئی مخصوص مرض آپ کی صحت کو مسلسل متاثر کررہا ہو۔ اور اس سے نجات آپ کی تمنا ہو۔
☐ آپ سینے کے پرکشش نسوانی حسن سے محروم ہوں اور اس محرومی نے آپ کو احساس کمتری کا شکار بنادیا ہو۔
☐ ایسی کسی بھی صورت میں مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ساتھ روانہ کردیں [illegible]

مرد اپنے خطوط بنام ڈاکٹر علوی روانہ کریں۔
خواتین لیڈی ڈاکٹر شگفتہ کے نام اپنے خطوط لکھیں۔
[illegible]

ادارہ حسن و صحت
پوسٹ بکس ۲۵۲۱ کراچی ۱۸

اُس کے لیے دوپہر کا کھانا وہ خود ہی لاتی تھی لیکن پُراسرار ڈرائیور نے اس پر ذرہ برابر بھی حیرت ظاہر نہ کی بالکل اسی طرح اکھڑا بیٹھا رہا جیسے خلافِ توقع کوئی بات نہ ہوئی ہو۔ صبیحہ اس کے رویے پر جھنجلا گئی۔

"اب اُٹھ کر سنبھالو بھی۔ یہاں یونہی لیے کھڑی رہوں گی۔"

"اوہ... اچھا۔" وہ اُٹھتا ہوا بولا اور کھانے پر نظر پڑتے ہی ایسا بُرا سا منہ بنایا جیسے اُبکائی روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کیوں، کیا بات ہے؟" صبیحہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"پھر وہی ارہر کی دال..." ڈرائیور بسور کر بولا۔ "وہ بھی برداشت کی جا سکتی ہے اگر لہسن کا بگھار نہ لگا ہوا ہو۔"

"بڑے لاٹ صاحب ہو۔"

"اور میں ہر کھانے کے بعد پڈنگ پسند کرتا ہوں۔ وہ نہ ہو تو کسٹرڈ اور فروٹ ہی سہی۔"

"ہوش میں ہو یا نہیں؟"

"شراب تو قطعی نہیں پیتا... البتہ تعلق طبع کے لیے جن جنجر یا کوکاکولا سے شوق کر لیتا ہوں۔"

"سینی سنبھالو۔"

"اس طرح سینی لیے پھرنا بھی تمہارے لیے مناسب نہیں۔" ڈرائیور نے سینی لے کر اسٹول پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بنگلے سے اس کوٹھری تک ایک پختہ روش بنانی چاہیے تاکہ میرا کھانا ٹرالی پر لایا جا سکے۔"

"تمہیں دھکے دلوا کر نکال ہی نہ دیا جائے۔"

"دھکے کے بغیر نہیں اسٹارٹ ہوگی۔ بیٹری ڈاؤن ہے۔ گاڑی رننگ میں تو ہے ہی نہیں۔"

"جلدی کھاؤ۔ مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔"

"ابھی تو میں کہوں کہ دوپہر کا کھانا گیارہ بجے ہی کیسے آ گیا۔" اس نے کھانے پر بیٹھ کر اسٹول اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ پھر سالن کا نوالہ لیا ہی تھا کہ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اب کیا ہے؟" وہ جھلا کر بولی۔

لیکن وہ کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف جھپٹا اور دوسرے ہی لمحے میں نوالہ تھوک کر بُری طرح منہ پیٹ رہا ہے۔

"ارے مر گیا۔ اتنی مرچیں... ہائے... سوسوسوسو...

بھپ... پانی... سی سی سی سی۔"

"اب میں پانی بھی پلاؤں گی تمہیں؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"نل ہی پی لوں گا مگر کھانا میرے دل و دماغ کو قبر سے اُکھاڑنے کے لیے کافی ہو گا۔"

"تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اتنے نخرے نہیں برداشت کیے جا سکتے۔"

"ارے تو میں کچھ کہہ رہا ہوں۔ دو بھی چپاتیاں پانی کے گھونٹوں سے اُتار لوں گا۔"

"جہنم میں جاؤ۔" وہ کوٹھری سے نکلتی ہوئی بولی۔ "میں ابھی آ رہی ہوں۔ گاڑی نکالو۔"

عجیب آدمی تھا۔ اس طرح ملازمت حاصل کی اور اب اس طرح دھونس جما رہا ہے۔ جیسے جیسے پیچھے پڑ گیا ہو اس سے۔ کہیں پھر دنوں کے بعد بلیک میل نہ کرنا شروع کر دے۔ وہ سوچتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

نوٹس کا فائل اُٹھایا اور پھر وہ لفافہ اُٹھانے کے لیے جھکی جو فائل سے گرا تھا۔ سبز رنگ کا لفافہ۔ وہ سوچنے لگی کہ اس نے تو کوئی لفافہ فائل میں نہیں رکھا تھا پھر یہ کہاں سے آیا۔ لفافے پر کچھ تحریر نہیں تھا۔ دبازت بتاتی تھی کہ اندر بھی کاغذ موجود ہے۔ لفافہ کھلا ہوا بھی نہیں تھا۔ وہ چند لمحے اس کے متعلق سوچتی رہی۔ شاید کبھی رکھ کر بھول گئی ہو لیکن کبھی اس نے سبز رنگ کے لفافے استعمال نہیں کیے تھے۔

پھر اس نے کھول ہی ڈالا۔ اندر سے انگریزی حروف میں ٹائپ کیا ہوا خط برآمد ہوا۔

"صبیحہ! میں تمہارے جرم سے واقف ہوں۔ سہیل مرنے سے قبل ہوش میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنے بیان پر خود دستخط کیے تھے۔ اس کا بیان میرے پاس محفوظ ہے۔ بیان اسی کی آواز میں ریکارڈ بھی کیا گیا تھا۔ ٹیپ میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ دونوں چیزیں عدالت میں تمہارے خلاف استعمال کی جا سکتی ہیں۔ اسے کبھی نہ بھولنا۔ فی الحال رخصت۔ تم اب پوری طرح میری مٹھی میں ہو۔"

صبیحہ کے ہاتھ کانپے اور خط چھوٹ پڑا۔ سر چکرانے لگا۔ میز کا سہارا نہ لیتی تو گر پڑی ہوتی۔ کئی منٹ تک وہ میز کے گوشے پر ہاتھ ٹکائے جھکی کھڑی رہی۔

تو یہی ہوا! اس مردود نے آخر کار بلیک میلنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اب کیا ہوگا۔ اب تو میں واقعی اس کی مٹھی میں ہوں۔ کاش مجھ سے وہ حرکت سرزد نہ ہوتی۔ سال کا ہی جلایا تھا یا اللہ

معاف کرے... سبز لفافہ... میرے مالک! وہ سوچتی رہی پھر پے در پے ہارن کی آواز سن کر چونکی۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ لفافہ فائل میں رکھتی ہوئی باہر نکل آئی لیکن قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

وہ اسٹیئرنگ پر بیٹھا نظر آیا۔ کتنا خوفناک لگ رہا تھا اس وقت۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک نے چہرے کو پہلے سے زیادہ بھیانک بنا دیا تھا۔

وہ پچھلی نشست پر نیم مُردہ سی گر گئی۔

کار جھٹکے سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھی۔ ڈرائیور خاموشی سے اسٹیئرنگ کر رہا تھا۔ صبیحہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اگر اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع دیتی تو خود اس کی ذات بھی اس معاملے میں ملوث ہو کر رہ جاتی۔ خاموشی اختیار کرنے کی صورت میں نہ جانے کیا حشر ہو؟ آخر یہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے؟ لیکن وہ وہاں اپنی مرضی سے کب آیا تھا۔ خود اس کے ملازمین پکڑ لائے تھے لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی آمد کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوئی ہو۔ اب اُسے کیا کرنا چاہیے۔ کیا براہ راست اس سے گفتگو شروع کر دے؟

پھر اُسے سہیل یاد آیا جو اس کا تعاقب کیا کرتا تھا۔ کیسے مضبوط جسم کا آدمی تھا جسے اُس نے ٹھوکروں پر رکھ کر موت ہی کی طرف دھکیل دیا لیکن کون جانے یہ بھی شخص فراڈ ہو۔ سہیل نہ رہا ہو۔

صبیحہ کی اُلجھن بڑھتی رہی پھر اُسے اس پر غصہ بھی آنے لگا۔

اس نے سوچا جو کچھ ہونا ہو گا اس سے دو دو ہاتھ ہی ہو جائیں۔ کار یونیورسٹی والی سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

"سڑک کے کنارے روک کر گاڑی کھڑی کر دو۔" دفعتاً اس نے اپنے لہجے میں سختی پیدا کر کے کہا۔

رفتار کم ہوتی گئی اور گاڑی سڑک کے کنارے جا لگی۔ ڈرائیور نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اسٹیئرنگ پر جھکا بیٹھا رہا۔

"میں تم سے خائف نہیں ہوں... سمجھے؟" صبیحہ غرائی۔

"میں تمہارا نوکر... پھر خائف ہونے کا کیا سوال؟" جواب ملا۔

"سنجیدگی سے گفتگو کرو۔"

"بالکل سنجیدہ ہوں۔"

"تم مجھے بلیک میل نہ کر سکو گے۔ میں کسی چیز سے بھی نہیں ڈرتی۔ بدنامی یا نیک نامی کا خیال بزدلوں کو آیا کرتا ہے۔"

"اطلاع پا کر خوشی ہوئی۔ اور کچھ؟"

"شٹ اپ یو ڈرٹی سوائن۔"

"انگریزی میں گالیاں بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ البتہ اُردو کی بات دوسری ہے۔ تمام گُل افشانی کُھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں خاموش رہو۔" وہ غصے سے پاگل ہوتی جا رہی تھی۔

"تم گالیاں دیے جاؤ اور میں پسندیدگی کا اظہار بھی نہ کروں۔"

"تم انگریزی سمجھ لیتے ہو؟" وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔

"جرمن اور فرانسیسی بھی۔"

"لیکن تم مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔"

"بہت دیر سے تم بلیک میل کی رٹ لگائے ہوئے ہو لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ اچھوتا خیال کیسے آیا؟"

"اس کے قابل تم خود ہی ہو۔ میں نے تم سے مدد بھی نہیں مانگی تھی۔"

"میرے خدا! میں اپنا سر کہاں دے ماروں۔"

"مکاری کی باتیں مجھ سے نہیں چلیں گی۔ تم میرا [illegible]"

"اب اگر تم اصل معاملے کی طرف نہ آئیں تو میں خود اپنا حلیہ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔"

"مجھے اس خط کا مقصد بتاؤ۔"

"کس خط کی بات کر رہی ہو؟"

"جو تم نے میرے فائل میں رکھ دیا تھا۔"

"میں نے تمہارے کسی فائل میں کوئی خط نہیں رکھا۔"

"تم جھوٹے ہو۔"

"فائل کہاں تھا تمہارا؟"

"میرے سونے کے کمرے میں۔"

"میرا خیال ہے کہ پرسوں رات کے علاوہ میں بنگلے کے اندر نہیں گیا۔"

صبیحہ نے سوچا بات تو ٹھیک ہی ہے۔ اسٹور روم سے رہائی کے بعد سے وہ بنگلے کے اندر کبھی نہیں دیکھا گیا تھا لیکن کیا پتا گھر کا کوئی ملازم بھی تو اس کا مددگار بن سکتا ہے۔ مفت ہاتھ آنے والے پیسوں میں بڑی قوت ہوتی ہے۔

"تم نے میرے کسی ملازم کو بھی بدطینت بنا دیا ہو گا۔"

"وہ تو ویسے بھی صورت حرام اور بدطینت ہیں۔"

"تو تم نے ایسے ہی بدطینت کے ذریعے وہ خط میرے فائل میں رکھوایا تھا؟"

"میں نے اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی۔ کیا میں تم سے کوئی زبانی بات نہیں کہہ سکتا؟"

"تو یہ لفافہ تم نے نہیں رکھوایا تھا؟" اس نے فائل سے

سیرنگ کا لفافہ نکال کر اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور نے پُرتشویش انداز میں سر کو ہلکی جنبش دی لیکن لفافہ اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

"دیکھو!" صبیحہ نے لفافہ اگلی سیٹ پر ڈال دیا۔

ڈرائیور نے لفافے سے خط نکالا اور اُسے باآواز بلند پڑھنے لگا۔

صبیحہ حیرت سے سُن رہی تھی۔ لہجہ اور تلفظ سے معلوم ہو رہا تھا جیسے واقعی اس کی تعلیم بڑے سلیقے سے ہوئی ہو۔

خط ختم کرنے کے بعد اس نے ایک طویل سانس لی اور مُڑ کر صبیحہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"بھلا مجھے اس کی کیا ضرورت تھی جب کہ وہ میری ہی غربت کی وجہ سے مرا ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے بدمعاشوں کی بنائی ہوئی سکیمیں ایسی ہوتی ہیں۔ میں خود بھی نہیں سمجھ سکتی کہ تمھیں اس سے کیا فائدہ پہنچے گا جب کہ میں اس کا اعتراف کر سکتی ہوں کہ وہ میری کوٹھی ہی میں پٹا تھا اور جس نے پیٹا تھا وہی مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اس سے یہی تو ثابت ہوتا ہے کہ اس خط کا تعلق تمھاری ذات سے نہیں۔"

صبیحہ کچھ نہ بولی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اُسے کیا کہنا چاہیے۔

دفعتاً ڈرائیور نے کہا۔ "گھر واپس چلو۔"

"کیوں؟"

"میں دیکھوں گا کہ یہ خط تمھارے کمرے تک کس ذریعے سے پہنچا ہوگا۔ ہاں۔۔۔ آج کوئی باہری آدمی بھی آیا تھا؟"

"نہیں کوئی بھی نہیں۔"

"تب تو تمھارے تینوں ملازموں ہی میں سے کوئی ہو سکتا ہے۔"

"پتا نہیں۔"

"تمھارے چھوٹے بھائی بہن تو تمھارے لیے دوسروں کے خطوط نہیں لاتے ہیں۔"

"کیا نہیں!" وہ کھسیا کر غصیلے لہجے میں بولی۔ "عشق کرنا ہوگا تو اطلاع کر دوں گی۔"

"شاباش شاباش۔۔۔ پھر واڑ! لیکن ہو سکتا ہے کہ بچوں ہی میں سے کسی کو وہ خط مل گیا ہو۔"

"میں نہیں جانتی۔"

"تو پھر چلوں واپس؟"

"جیسا آپ چاہیں۔"

"لیکن اتنی جلدی واپسی کا جواز کیا پیش کرو گی؟"

"پروفیسر چٹرجی چھٹی پر ہیں۔ کلاس نہیں لیں گے۔"

"سبحان اللہ سبحان اللہ! اچھی بات ہے۔"

ڈرائیور نے اگنیشن اسٹارٹر کے بٹن کو دبایا اور گاڑی پھر گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ بقیہ راستہ خاموشی ہی سے طے ہوا۔

گھر پہنچ کر گاڑی سے اترتے ہوئے صبیحہ نے آہستہ سے پوچھا۔ "کیسے پتا لگاؤ گے؟"

"تمھاری دانست میں تمھارے ملازموں میں سب سے زیادہ خبیث کون ہے؟" ڈرائیور نے سوال کیا۔

"مجھے سبھی خبیث معلوم ہوتے ہیں۔"

"اچھا تو تینوں خبیثوں کو کسی بہانے سے میرے پاس بھیج دو۔"

"کیا کرو گے تم؟"

"اگلواؤں گا اُن سے! اور تم صرف آدھے گھنٹے کے لیے میری کوٹھری سے دور رہنا۔"

صبیحہ اندر چلی گئی۔ پہلے ایک ملازم کو بلا کر اس سے کہا کہ وہ ڈرائیور کو بلا لائے۔ پھر دس منٹ بعد دوسرے کو بھیجا اور ان دونوں کی واپسی کی منتظر رہی لیکن ان میں سے کوئی بھی نہ پلٹا۔

پندرہ منٹ بعد تیسرے کو روانہ کیا۔

پورا ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن ان میں سے کسی کی بھی واپسی نہ ہوئی۔ اُس نے سوچا اب خود ہی چل کر دیکھنا چاہیے۔

وہ کوٹھری جہاں ڈرائیور کا قیام تھا مہندی کی قدِ آدم باڑھ کی اوٹ میں تھی اس لیے بنگلے کے برآمدے میں کھڑے ہوئے کسی آدمی کی نظر میں آئے بغیر وہ اُس کے دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔

کوٹھری کا دروازہ بند ملا۔ اندر سے کنڈی چڑھا دی گئی تھی۔

وہ چند لمحے خاموش کھڑی سُن گُن لیتی رہی لیکن اندر سے کسی قسم کی بھی آواز نہ آئی۔ پھر اُسے دروازے کی جھری سے جھانکنا ہی پڑا۔

اندر کے حالات تشویش ناک تھے۔ تینوں ملازموں کے ہاتھوں اور ٹانگوں میں ڈنڈے پھنسا کر اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ جنبش بھی نہ کر سکتے تھے۔ منہ میں کپڑا بھی نہ ٹھونس دیا گیا ہوتا تو وہ غل غپاڑہ مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیتے۔

اور ڈرائیور سامنے والے جھلنگے پر انھیں کے رُخ کروٹ لیے سو رہا تھا۔

صبیحہ بوکھلا گئی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آخر وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟

دفعتاً ایک ملازم کے حلق سے عجیب سی گھٹی گھٹی آوازیں نکلنے لگیں اور ڈرائیور نے اس طرح آنکھیں کھول کر دیکھا جیسے بچوں کے شور میں بھی گہری نیند سونے والے کسی عیال دار بوڑھے کے کانوں میں کوئی نئی آواز پڑی ہو۔

اُس نے سیدھے ہو کر پورا جسم تان لیا۔ بیٹھے ہی بیٹھے انگڑائی لی اور اٹھ کر اس شور مچانے والے کو پُرتشویش نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" ڈرائیور نے سر ہلا کر کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ اس لیے تمھارے علاوہ اور سب کی چھٹی۔ تم میں سے کوئی بھی دوسرے کے متعلق نہیں جانتا کہ میں نے اس سے کیا پوچھا تھا۔ لہٰذا اس کا تذکرہ کوئی کسی سے نہ کرے ورنہ جان سے مار دوں گا۔ مجھے ڈپٹی صاحب نے کوٹھی کی نگرانی کے لیے بھیجا ہے سمجھے؟"

پھر اُس نے ان دونوں ملازموں کو آزاد کر دیا جنھیں صبیحہ نے بے حس و حرکت اور خاموش دیکھا تھا۔

"ایک ایک کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔ تمھارے کسی معمول میں فرق نہ آنا چاہیے سمجھے؟" ڈرائیور نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔

صبیحہ نے سوچا اب وہ باہر نکلیں گے۔ لہٰذا ان کی نظروں میں نہ آنا چاہیے۔ وہ قریب کی بے ترتیب جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئی۔

کچھ دیر بعد اس نے انھیں مالی کی کوٹھری سے نکلتے دیکھا۔ چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

صبیحہ جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر پھر دروازے کے قریب آ گئی۔ جھری سے آنکھ لگائی ہی تھی کہ اندر سے ڈرائیور کی آواز آئی۔

"اب آپ بھی اندر آ سکتی ہیں بی بی جی! کنڈی نہیں لگی ہے۔"

وہ سناٹے میں آ گئی اور غیر ارادی طور پر ہاتھوں نے آگے بڑھ کر دروازے کو دھکا دیا۔ دونوں پٹ کھل گئے تھے۔ تیسرا ملازم بھی اب آزاد ہو چکا تھا۔ صبیحہ نے اُس پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"یہ ہے وہ ملازم جس نے لفافہ آپ کی فائل میں رکھا تھا۔" اُس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"کیوں؟" صبیحہ اُس کی طرف مُڑی لیکن وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"کس نے دیا تھا تمھیں وہ لفافہ؟" صبیحہ نے پھر کانپتی ہوئی آواز میں سوال کیا لیکن اس کا بھی جواب اُسے نہ مل سکا۔

"کسی نے دس روپے دے کر اس سے یہ خدمت لی تھی۔" ڈرائیور نے خشک لہجے میں کہا۔

"کس نے؟"

"اُسے پہچانتا نہیں۔" ڈرائیور بولا۔

"تم نے یقین کر لیا؟"

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسے یہاں سے جو تنخواہ ملتی ہے اس کے گزر اوقات کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ دس روپوں کے لیے قتل بھی کر سکتا ہے۔ یہاں تو صرف ایک خط رکھنا تھا اُس فائل میں جسے تم عام طور پر استعمال کرتی ہو۔"

"میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔"

"وہ اس سے کچھ وصول کر کے چھوڑ دیں گے۔ ان بے چاروں کی تنخواہیں بھی ان کے لیے ناکافی ہوتی ہیں لہٰذا اس بے چارے کو دس روپوں کے نفع ہی میں رہنے دو۔ ویسے پیارے کہیں تم بھی تو ہزار اسکالر یونیورسٹی کے ایل ایل ڈی نہیں؟"

"فضول باتوں میں نہ پڑو۔ اسے پولیس کے حوالے کر دو۔"

"نہیں اس کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ فوری طور پر یہاں سے منہ کالا کر جائے۔"

"کم بخت نمک حرام! اٹھو دفع ہو یہاں سے۔"

ڈرائیور نے ہاتھ ہلا کر اُسے وہاں سے چلے جانے کا اشارہ

ناظم آباد
کے بازاروں میں ایک اور بازار
مین بس اسٹاپ پاپوش نگر چوک
طاہر سینٹر
جدید ترین شاپنگ سینٹر

کیا اور وہ اسی طرح سر جھکائے ہوئے باہر نکل گیا۔ حبیبہ نے بھی اس کے پیچھے جانا چاہا تھا۔

"ٹھہرو!"

"نہیں، میں اُسے ضرور منا لاؤں گی۔"

"اور وہ دوسروں کو اس کی وجہ بتاتے ہوئے یہ بھی بتا دے گی کہ اس خط کی نوعیت کیا تھی۔ کیوں؟"

حبیبہ کے قدم رک گئے۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر بولی۔ "مجھ میں نہیں آتا کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں اور اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

*

صفدر کو جوزف پر غصہ آ رہا تھا۔ اُن کمرے میں بیٹھے رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ بدستور دروازے ہی پر کھڑے رہ کر بھی ہو سکتا تھا۔

اس نے جوزف سے بھی اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتایا تھا کہ "مقدر مقدر!"

پھر صفدر نے [illegible] اس سے بات نہیں کی۔ جوزف کا سر زخمی تھا۔ ڈاکٹر کے بیان کے مطابق وافر مقدار میں خون ضائع ہو گیا تھا۔

جوزف والے واقعے کا علم ہوٹل کے باشندوں کو ہو چکا تھا لیکن یہ بات کسی کو بھی نہ معلوم ہو سکی کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ ساجدہ کی گمشدگی کے بارے میں صفدر نے بھی اپنی زبان بندی رکھی تھی۔

جوزف اس وقت ہوٹل کے اس کمرے میں تھا جہاں ابتدائی طبی امداد کے لئے وقتی طور پر رکھے جاتے تھے اور پھر انہیں کسی اسپتال میں منتقل کر دیا جاتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی اسے جوزف کے پیچھے چلا ہونا پڑا۔ ہوٹل کے ڈاکٹر کا اصرار تھا کہ اُسے اسپتال بھیج دیا جائے۔

"کیا میں مر رہا ہوں؟" جوزف نے پھر ڈاکٹر سے الجھ کر پوچھا۔

"یہ میں کچھ نہیں جانتا مسٹر! قانون یہی قانون ہے۔"

"میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم کسی کالے آدمی کا وجود برداشت نہیں کر سکتے!"

"ایسی کوئی بات نہیں!"

"تم یہاں سے کہیں نہ جاؤں گا مجھے۔ کیا میں بیمار ہوں۔ جانوروں کا پتا لگاؤ جنھوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ وہ یقینی طور پر دو آدمی تھے!"

"پولیس پتا لگائے گی۔ یہ میرے فرائض میں شامل نہیں!"

"اسپتال بھجوا دینا ہے تمہارے فرائض میں داخل!"

پھر وہ ڈاکٹر جھلا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ریشا جبراً اٹھ کر کمرے میں داخل ہوئی۔

"اسے کیا ہوا؟" اس نے متفکر اڑانے والے انداز میں جوزف سے پوچھا۔

"وہی جو اب تک ایسے حالات میں ہوتا آیا ہے۔"

"کیا بک رہے ہو۔ میں کچھ نہیں سمجھی!"

"تمہارے کسی سفید فام ساتھی نے میرا سر پھاڑ دیا!"

"بکواس ہے!"

"یقین کرو مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کسی دن تمہاری آواز سنی تھی!"

"کیا پولیس کو بھی بیان دیا ہے؟"

"اے مسٹر! اب تم جاؤ!" جوزف نے جھلا کر ڈاکٹر سے کہا۔

پھر ڈاکٹر نے ریشا کی طرف دیکھا اور ریشا نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ چلا جائے۔

"تم خواہ مخواہ میرا نام کیوں لے رہے ہو؟" ریشا نے اس کے چلے جانے کے بعد جوزف سے غصیلے لہجے میں پوچھا! "کیا تم نے حملہ آوروں کو پہچانا تھا؟"

"یہی تو مشکل ہے کہ پہچان نہیں سکا تھا ورنہ اب تک یہاں خون کی ندیاں بہہ جاتیں!"

"پھر میرا نام کیوں لے رہے ہو؟"

"تمہاری نسل کے لوگ کیسے تو اور کچھ ہوتے ہیں!"

"میں کہتی ہوں خاموش رہو ورنہ اچھا نہ ہوگا!"

"اب اس سے بھی کیا برا ہوگا؟"

"میں خیریت دریافت کرنے آئی تھی اور تم بد اخلاقی پر اتر آئے!"

"تو خیریت دریافت کرو!" جوزف نے خلاف توقع دانت نکال دیے۔ اگر اُس کے جاننے والوں میں سے کوئی یہاں موجود ہوتا تو اُس کی آنکھیں خوف و حیرت سے پھیل گئی ہوتیں۔ یہ جوزف تھا جو ابھی نگاہوں کی آنکھوں سے ریشا کو دیکھ رہا تھا۔

جوزف جو کسی عورت کے قریب کو بھی خطرے کی بو جیسی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اچانک اس طرح بدل گیا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟"

"میں نہیں جانتا مسی! کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔ میں پانی پینے اندر گیا تھا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا ہی تھا کہ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ کسی وار سے لگے تھے۔ ہوش میں آ کر سر پر بندھی ہوئی پٹی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے دل میں دبیہ والی حرکت کسی کو قابل گزری ہیں؟"

"تم تو ایسی کوئی حرکت نہیں کرتا!" جوزف نے حیرت آمیز معصومیت کا مظاہرہ کیا۔

"تم کرتے ہو جب بہت زیادہ پی جاتے ہو!"

"ہا نہیں!" جوزف ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میں بہت بد قسمت آدمی ہوں۔ ماں باپ دونوں مر چکے ہیں!"

"افسوس مجھے افسوس ہے!" ریشا نہ صرف سنجیدہ بلکہ کسی حد تک رنجیدہ بھی نظر آنے لگی۔

"نہیں میں جن لوگوں کے ہاتھ پڑا تھا وہ مجھے جلتی زمین پر لٹا کر سینے پر پتھر رکھ دیا کرتے تھے۔"

"بس کرو!" ریشا ہاتھ اٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "ایسی باتوں سے مجھے دکھ ہوتا ہے!"

"ٹھیک ہے مسی!" جوزف نے طویل سانس لی۔ "کون ہے اس دنیا میں جو میرے نام کی بھیک لے کر میرے سینے کا بوجھ ہلکا کرے!"

"صرف مسی!" وہ کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی بولی "لیکن تین منٹ بعد میری ڈیوٹی شروع ہو جائے گی!"

"تم یہاں کیا کام کرتی ہو مسی؟"

"ٹیلی فون آپریٹر ہوں!"

"اچھا کام ہے مسی! تم میرے پاس رہا کرو نہیں جا سکتیں؟ میرا باس بڑا ظالم آدمی ہے کاش میں بھی ٹیلی فون آپریٹر ہوتا!"

"تم ہوتے؟" ریشا نے غالباً ہنسی روکنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں ٹیلی فون پر گالیاں دینے والے سامنے تو نہیں ہوتے کہ ان کا سر پھاڑ دینے کو جی چاہے!"

"تو کیا باس تمہیں گالیاں دیتا ہے!"

"ہاں مسی! بہت گندی گندی لیکن کیا کروں۔ اب وہ دیر آگا ہے میرے پیچھے آتا ہے مجھے اس کے پاس رہنا ہی پڑے گا!"

"میں سمجھتا ہے تم کو بھی ایک آدمی کو اپنا [illegible] ہوتی ہے!"

"لیکن مجھے اپنے اس آقا سے کوئی شکوہ نہیں ہے!"

"آخر وہ کون تھا غلام؟"

"اُسے غلام نہ کہو بہت اچھا آدمی ہے!"

"اس کے باوجود بھی کہ اس نے تمہیں یہیں پر ایک آدمی کو رکھ دیا؟"

"ہاں مسی! مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ میری کھال کے جوتے بھی پہن سکتا ہے!"

"ذرا مجھے اس کا نام اور پتا بھی تو بتاؤ میں دیکھوں گی کیسے دیکھتی ہوں؟"

"یقیناً! وہ آدمی بیسویں صدی کے لیے عجوبہ ہوگا!"

"نہیں وہ برا آدمی نہیں ہے!" جوزف نے بُرا مان کر کہا۔

"ویسے اس وقت تم بھی عجوبہ ہی معلوم ہو رہے ہو!"

"کیوں؟"

"میں نے تمہیں اتنے شریف موڈ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا!"

"انسانوں پر مرنے کے بعد وہ بھی شریف ہو جائے گا۔ جس نے آدم کو جنت سے نکلوایا تھا!"

"تم بچھ ہی... اوہ صرف ایک منٹ باقی ہے مجھے پہنچ جانا چاہیے!" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔

❖

ساجدہ کو کئی گھنٹے تک وہاں اسی حال میں پڑے رہنا پڑا تھا پھر وہ دونوں واپس آئے تھے اور انھیں دیکھ کر ساجدہ نے اپنی آنکھوں کو متعجب آلود بنانے کی کوشش شروع کر دی تھی جن میں سے ایک نے اس کے منہ سے پٹی کھول کر حلق تک ٹھونسا ہوا کپڑا نکالا اور وہ انہیں برا بھلا کہنے لگی۔

"اگر میں اسی وقت چیخنا شروع کر دوں تو کوئی میرا کیا بگاڑ لے گا؟"

"کچھ نہیں! اب تو تمھارا کچھ بھی نہیں بگاڑا جا سکتا۔ ساتھیوں کا خیال ہے کہ تم بھی ہوٹل سے باہر نہیں گئیں!"

"ساتھیوں سے کیا مراد ہے۔ میرے ساتھ صرف دو آدمی صفدر اور جوزف تھے جن کے علاوہ کسی کو میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم!"

"ابھی دونوں کی بات کر رہا ہوں!"

"وہ کالا تو زندہ ہے یا مر گیا؟"

"اس کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو کم از کم وہ مر ہی جاتا!"

"تو وہ زندہ ہے؟"

"نہ صرف زندہ ہے بلکہ باتیں بھی بنا سکتا ہے!"

"جہنم میں جائے۔ یہ بتاؤ کہ میرے لیے کیا طے پایا؟"

"تمہیں یہاں سے چلنا پڑے گا۔ ہیڈ کوارٹر میں پہنچانے کا حکم ملا ہے!"

"ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟"

"کیا تمہیں کوئی علم ہے اس کا؟"

"میں نے کہا شاید عادل آباد والے جانتے ہوں!"

"اور عادل آباد والوں کا خیال ہے کہ وہ دارالحکومت میں

ہوں کہیں ہے؟"

"جوزف تو کبھی جا چکا ہے کیونکہ صفدر انجی کا پیغام [illegible] دارالحکومت تک دے دیا تھا۔"

"صفدر انجی؟" وہ ایک سے مخاطب [illegible] کیا وہ دونوں بھی تھے۔"

"کیوں؟"

"[illegible] صفدر [illegible] بھی نہیں۔"

"کیوں نہیں، وہ تو تھے ہی۔"

"غالباً یہ تمہارا [illegible] ابتدائی دور تھا۔"

"ہاں تو پھر؟"

"[illegible] انجی کے [illegible] ہے؟"

"پھر [illegible] کون تھے؟"

"[illegible] جوزف سے [illegible] ہو گیا تھا، وہ دارالحکومت والی شاخ کو اپنے تابع فرمان بنانا چاہتا تھا۔"

"[illegible] کے اختلافات تھے؟"

"[illegible] جواب دیا۔

"[illegible] ہو گئے ہیں؟"

"انجی کو [illegible] نہیں [illegible] کر دو اب یہی سوچنا ہے کہ [illegible] کس طرح [illegible] جائے؟"

رات کے [illegible] صفدر جوزف کو اپنے کمرے میں [illegible] دیا تھا [illegible] پیغام [illegible] تھا۔ [illegible] جوزف [illegible] تھا [illegible] کی طرف [illegible] تھیں۔

وہ [illegible] سنبھال کر بیٹھ گیا۔ [illegible] تھی۔ جوزف [illegible] بیٹھا تھا۔

پیغام کے اختتام پر [illegible] کا اشارہ ملا اور صفدر [illegible] جوزف نے [illegible] لی۔

"وہ [illegible] ہے" صفدر نے کہا "[illegible] تھے۔ اب تک [illegible] ہے؟"

"وہ [illegible] دونوں [illegible] تھے۔"

"اس کے علاوہ اور کیا بھی جا سکتا ہے؟"

"ہوں" جوزف نے [illegible] کے [illegible] پینے لگا۔

"میں [illegible]" وہ [illegible] تھا [illegible] اپنے [illegible] میرے [illegible] ہیں؟"

پھر وہ [illegible] کی طرف [illegible] تھا کہ صفدر نے اس کا [illegible] لی۔

"چھوڑو [illegible] مجھے چھوڑ دو۔"

"تم [illegible] ہو گئے ہو [illegible] صرف دیکھنا [illegible] منظور ہے۔"

"[illegible] فراق [illegible]"

"جوزف [illegible] تمہارا [illegible] نہیں [illegible] سکتا۔"

"مجھے [illegible] چھوڑ دو مجھے [illegible] افسوس ہوگا۔"

صفدر نے [illegible]

"بس اب چھوڑ دو" جوزف نے [illegible]

"نہیں [illegible] تم نہیں [illegible] صفدر [illegible] لگا۔

[illegible] ہو۔

جوزف کمرے سے باہر تھا۔

صفدر [illegible] اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ [illegible] جوزف [illegible] اس نے [illegible]

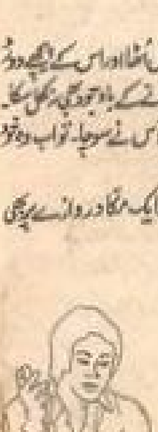وہ [illegible] اور [illegible] ایک [illegible] دروازے [illegible] تھا۔